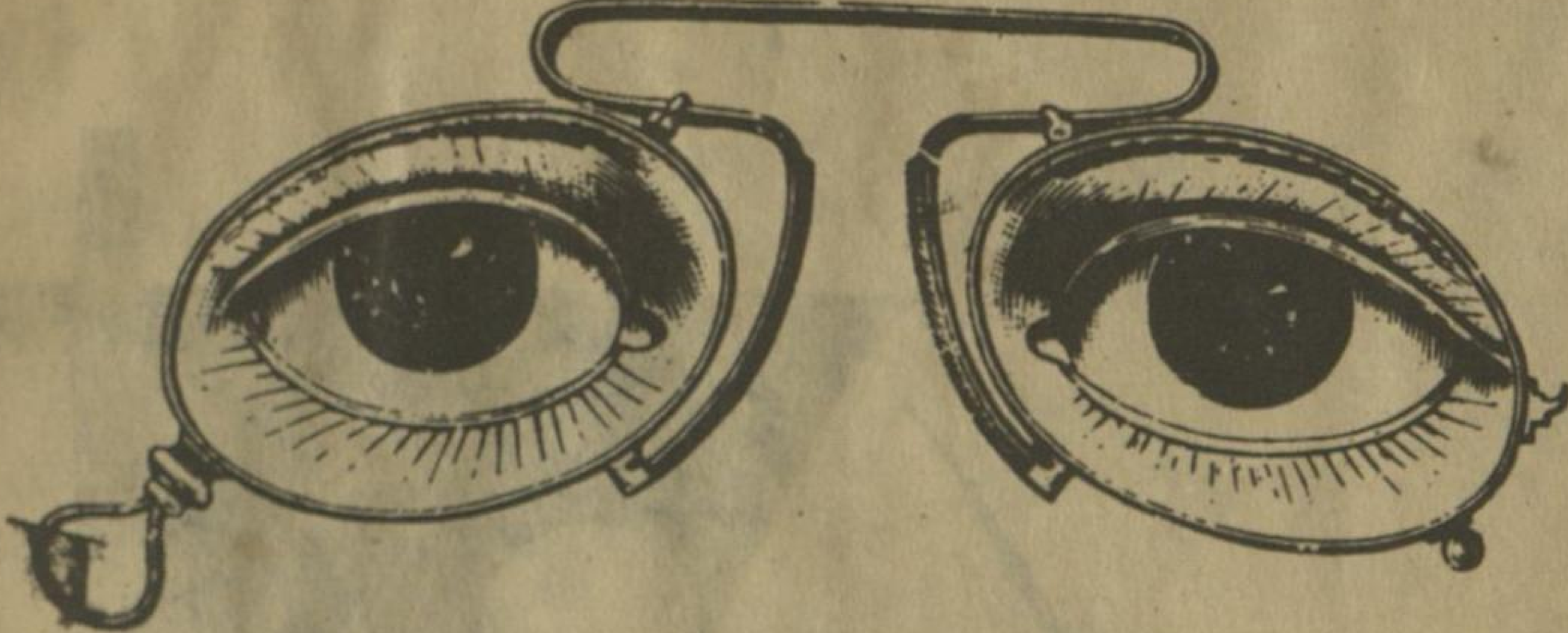

قطرے
کرشن چندر





نظارے

کرشن چندر

بک کارنر
پبلشرز، بکسیلرز، جنرل آرڈر سپلائر
فون ۲۰۸۵ چوک فیصل شہید بازار جہلم

باراول ۳۰ ستمبر ۱۹۷۸ء

اہتمام : شاہ حمید شفیق الرحمٰن

آرٹ خیالی آرٹ سٹوڈیو لاہور

مطبع طفیل آرٹ پرنٹرز لاہور

قیمت [redacted]

بک کارنر
پبلشرز سٹیشنرز بک سیلرز،
چوک فیصل شہید جہلم شہر فون ۲۸۸۵

رفتہ رفتہ

جنت اور جہنم

زینؔی کے متعلق میں کیا جانتا ہوں، یہ تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ انسان کی ذہنی کیفیتیں سمندر کے مدوجزر کی طرح دل کے ساحل پر آتی ہیں اور اکثر نہایت ہی لطیف، ناپائدار اور مبہم نقوش چھوڑ جاتی ہیں اور عموماً یہ مبہم سی تصاویر لہروں کے دوسرے ریلے ہی میں یوں فنا ہو جاتی ہیں کہ پھر کوئی ان کا نام و نشان بھی نہیں پا سکتا۔ یا پھر نئے نقوش اپنی تزئینِ نو اور حسنِ امتزاج سے نئی جمالیاتی کیفیتیں پیدا کر دیتے ہیں اور ان کے آغوش میں اس ساحل کی ریت کا ہر ذرہ گنگنا اٹھتا ہے۔

"کیا اس سے پہلے بھی زندگی تھی۔ یا یہ نغمۂ حیات کی ایک اضطراری کیفیت ہے۔"

لیکن بعض نقوش اس قدر ناپائدار اور مبہم نہیں ہوتے اور وہ

ساحلِ حیات پر ایسی تصویریں کھینچ دیتے ہیں جو مدت تک قائم رہتی ہیں.

ایسی ہی تصویروں میں سے ایک تصویر زینی کی بھی ہے اور دراصل ایک ہی نہیں بلکہ تین، کیونکہ جب کبھی مجھے زینی کا خیال آتا ہے تو بیک وقت اس کی تین تصاویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں، تین مختلف تصاویر، تین مختلف ملبے، نگاہ کے تین مختلف زاویے، جس طرح سات رنگوں سے مل کر قوسِ قزح بنتی ہے اسیطرح ان تین تصاویر کی ترتیب سے زینی کی زندگی کی کہانی بن جاتی ہے لیکن یہ زندگی قوسِ قزح سے بہت مختلف ہے کہیں مختلف !

دیکھنے میں تو زینی قوسِ قزح کی طرح ہی حسین تھی۔ میں نے جب پہلے پہل اُسے دیکھا، تو اس وقت میں سات پلوں والے شہر کے سب سے خوبصورت پل امیرا کدل پر جھکا ہوا جہلم کی سطح پر تیرتی ہوئی دنیا کا جائزہ لے رہا تھا۔ یوں ہی بیکار سا، آوارہ سا، اکتایا ہوا، سری نگر کی دلچسپیوں کو ایک بے کیف سطحی انداز سے دیکھ رہا تھا.

شکاروں کے لال لال پھولوں سے کڑھے ہوئے پردے ایک طرف کو ہٹے ہوئے تھے۔ اور ان میں کہیں موٹے موٹے مردوں کیساتھ پری وش عورتیں سوار تھیں. جن کے چہرے اور جن کے طلائی آویزے دوپہر کی دھوپ میں یکساں طور پر چمک رہے تھے.

کہیں تنومند، وجیہہ نوجوانوں کے ہمراہ بھدّی اور بدشکل عورتیں اپنے بہترین لباس پہنے بیٹھی تھیں، اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں معلوم ہوتی تھیں، جو عورت جتنی زیادہ بدصورت تھی۔ وہ اتنا ہی اچھا اور بھڑکیلا لباس پہنے تھی۔ دراصل پردے کی رسم توان ہی عورتوں کے لئے رائج کی گئی تھی۔ اوران کے شوہروں کے چہرے کم ازکم اس وقت تو اسی خیال کے آئینہ دار تھے۔

بیچارے دوسرے شکاروں میں بیٹھی ہوئی خوبصورت عورتوں کو گھور گھور کر اپنے نقصان کی تلافی کرنا چاہتے تھے اور ان کی اپنی بیویاں نہایت دلفریب، میٹھی آواز میں ہنس ہنس کر انھیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، کم ازکم مجھے ان کی آواز بہت شیریں معلوم ہوئی۔ شیریں جیسے کوئل کی کوک، اور آخر کوئل کا رنگ بھی تو سیاہ ہی ہوتا ہے۔

شکارے خوبصورت اور بدصورت مخلوق سے لدے ہوئے تھے۔ لیکن ان میں زندگی کی حرکت، بے چینی، اضطراب سب کچھ موجود تھا۔ وہ پانی کی سطح پر بھاگتے ہوئے جا رہے تھے لال لال پردے ہلتے ہوئے دکھائی دیتے۔ بھدّی شکلیں حسین تصویروں میں تبدیل ہو جاتیں، قہقہے اور راگنیوں کے گیت ایک

ہی نغمہ بن جاتے، اور وہ شکارے دربار ہال کے سامنے اس کے سفید سفید ستونوں کے قریب پہنچ کر شہر وینس کا سا نظارہ پیش کرتے ہوئے یک لخت موڑ پر غائب ہو جاتے، لیکن یہ حرکت، یہ زندگی ان لمبے لمبے دوم درجے کے ڈونگوں یا ہوس بوٹوں میں نہ تھی جو پانی کی سطح پر چپ چاپ بدنما بطخوں کی طرح تیر رہے تھے۔ ان کی کھڑکیاں بند تھیں لیکن پردے آویزاں تھے۔ صرف ایک ہوس بوٹ میں ایک کھڑکی کھلی تھی۔

کھڑکی کے دونوں طرف دو انگریز عورتیں بیٹھی ہوئی سویٹر بُن رہی تھیں۔ کیا یہ لوگ سری نگر میں سویٹر بُننے کیلئے آتے ہیں، یا میری طرح پل کے جنگلے کے قریب کھڑے ہو کر محض تماشا دیکھنے کیلئے؟

اور پھر مجھے اس وقت زینی دکھائی دی۔ جہلم کے پانی کا ایک ہی ریلا اُسے میرے دل کے ساحل کے قریب کھینچ لایا۔ وہ ایک چھوٹے سے ڈونگے کے کنارے پر کھڑی کشتی کا رخ بدل رہی تھی۔ رخ بدلنے کا چپو اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور چاندی کا ایک "جھمکا" اس کے کان میں کسی خاموش نغمے کی گت پر لرزتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ پھر جیسے وہ بجلی کی تیزی کی طرح پل کے نیچے سے گزر گئی۔ اور مجھے ڈونگے کا دوسرا سرا نظر آیا۔ یہاں ایک لمبی سی ڈانڈ لئے ایک گیارہ بارہ سال کا لڑکا ڈونگے کو کھے رہا تھا۔ اس کا گول سرخ و سپید چہرہ اور سر پر گول منقش ٹوپی،

بھی پُل کے نیچے غائب ہو گئی۔ اور جب میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ پل کی دوسری جانب آ پہنچے تھے۔ وہ ڈونگے کو نچلے گھاٹ پر لگانے کے لئے رخ بدل رہے تھے۔ ڈونگے کی سب کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان کھڑکیوں کے زرد زرد پردے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ میں نے کُن پٹیوں پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے ڈونگے کا نام پڑھا جو دھوپ میں چمکتے ہوئے نیلم کے ٹکڑے کی طرح درخشاں نظر آ رہا تھا۔ "THE HEAVEN" "جنت!" یہ نام غالباً کسی عیش پسند سیاح یا کسی انگریز پادری نے رکھا ہو گا۔

جنت اب نچلے گھاٹ کے قریب آ رہی تھی۔ اس کے ڈرائینگ روم کی بڑی کھڑکی کے اوپر ایک چوکور بورڈ لٹک رہا تھا۔ "TO LET" جنت کرائے کیلئے خالی تھی۔ میں جنگلے سے ہٹ کر ایک دو منٹ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ زینی اور چھوٹا لڑکا اب اسے کنارے پر باندھ رہے تھے۔ معاً میرے دل میں ایک خیال آیا۔ اور میں ایک تیزی سے امیرا کدل کے پل سے گزرتا ہوا نچلے گھاٹ کی سیڑھیوں کیطرف چلا گیا۔

زینی نے مجھے دیکھتے ہی سر جھکا کر سلام کیا۔ پھر وہ ڈانڈ کا سہارا لئے ایک عجیب جھجک اور ایک عجیب بیباکی کے ساتھ

کشتی کے کنارے پر کھڑی ہوگئی اور چھوٹے لڑکے سے بولی۔
"عزیزا، صاحب کو ہوس بوٹ دکھاؤ۔"
عزیزا ہنستا ہوا اٹھا۔ وہ یونہی ہنس رہا تھا بغیر کسی وجہ کے، کشمیری لڑکوں کیطرح، اس کے دانت جو ٹوتھ پیسٹ کے استعمال کے بغیر ہی غیر معمولی طور پر سفید تھے اس کے سرخ ہونٹوں کے درمیان موتیوں کی لڑی کیطرح چمک رہے تھے۔ اس نے اپنی ٹوپی سر سے اُتار کر بے پروائی سے زینی کے قدموں میں پھینک دی۔ اور پھر زینی نے جس ملائمت اور ملاطفت آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا ہے۔ اسے کچھ میں ہی بہتر جانتا ہوں۔ اس کی آنکھیں عزیزا کی اس معصوم شوخی پر ایک دم اس طرح چمک اٹھیں جیسے سحر کے وقت ڈل کے خاموش نیلے پانی پر آفتاب طلوع ہو جائے اور جب میں عزیزا کے ساتھ ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تو زینی کی تصویر آنکھوں کے سامنے ہی تھی۔
عزیزا کہنے لگا۔ "یہ ڈرائینگ روم ہے۔ یہ اس طرف آئینہ والا میز ہے، یہ لکھنے کا میز۔"
اور میں نے عزیزا سے پوچھا۔ "کیا یہ ہوس بوٹ تمھارا ہے اور وہ لڑکی کون ہے؟"
"وہ -؟" عزیزا نے یونہی سر ہلاتے اور مسکراتے

ہوئے کہا۔ "وہ زینی ہے میری خالہ، یہ ہوس بوٹ زینی کے خاوند کا ہے۔ وہ نوکری کی تلاش میں سولپور گیا ہے۔ یہ اس الماری میں چینی کے برتن، دو سیٹ، چمچے، پرچیں، یہ کھانے کے برتن، دو گیس لیمپ۔"

"اچھا، اچھا، آگے چلو۔"

"یہ سونے کا کمرہ ہے، وہ دوسرا کمرہ بھی سونے کا ہے ان میں پانچ پلنگ آ سکتے ہیں۔ میں اور زینی اس کمرے میں رہتے ہیں، وہ چھوٹا سا کمرہ، جو کچن کے قریب ڈونگے کے دوسری طرف ہے۔"

"اچھا چلو کچن دکھاؤ۔"

سب کچھ دیکھ لیا، اس چھوٹے سے دوم درجے کے ڈونگے کو جسے زینی اور عزیزا فخریہ لہجہ میں اپنا ہوس بوٹ کہتے تھے۔ زینی اور عزیزا کے ہونے والے "صاحب" نے جسے پنجاب میں اس کے سب دوست اس کے بے ڈھنگے پن کی وجہ سے "لگڑ بگڑ یا چرخ" کہتے تھے۔ سب کچھ دیکھ لیا۔ لیکن زینی کو بار بار دیکھ کر اس کے دل کی پیاس نہ بجھی۔

"زینی!" میں نے اپنی پتلون پر سے مٹی کا ایک خیالی ذرہ اڑاتے ہوئے پوچھا "اس ـــــ زینی، اس ڈونگے کا میرا مطلب ہے اس ہوس بوٹ کا کرایہ کیا ہوگا؟"

زینی نے اپنی باریک آواز میں کہا۔ "کیا صاحب یہیں رہیگا؟"

"ہاں، ہاں اسی بوٹ میں۔"

"تب یہ کرائے کیلئے خالی نہیں۔"

"ارے ——" میرے منہ سے بے اختیار نکلا

"وہ کیوں؟"

عزیزا ہنستے ہوئے بولا۔ "صاحب ہمیں وُلر جانا ہے۔
دراصل ہمیں سوپور جانا ہے، مگر راستے میں وُلر آئے گی، جھیل وُلر اور مانس بل، ہم یہ ڈونگا لے کر سوپور جائیں گے جہاں زینی کا گھر والا آگیا ہے، پھر ہم اس کو لے کر واپس آئیں گے اگر صاحب کو وُلر دیکھنا ہے، تو منظور، ہم سب کچھ دکھائیں گے اور کرایہ بھی تھوڑا ہوگا۔ اگر صاحب کو ادِھر ہی رہنا ہے تو پھر ہم مجبور ہیں۔"

میں تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا۔ عزیزا کا ہنستا ہوا معصوم سا چہرہ بہت پُر امید تھا۔ گویا وہ ملتجیانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"چلو صاحب، وُلر دیکھنے چلو صاحب۔"

میں نے زینی کیطرف دیکھا۔ زینی کا چہرہ آنچل کی اوٹ میں تھا۔ کیا وہ بھی اپنے خاوند سے ملنے کیلئے بیقرار تھی۔ اور تو۔ اے شاعر مزاج آوارہ سیاح! تو اس خطرناک مثلث کو کیوں

پورا کرنا چاہتا ہے؟ ہوس کے غلام! کیا تیرے لئے اس دنیا میں کوئی اور کام نہیں؟ کوئی آرزو۔ کوئی مطمح نظر نہیں؟

لیکن دل کے ساحل پر اس قسم کی لہریں بہت ہی چھوٹی چھوٹی ہلکی اور لطیف ہوتی ہیں، آئیں اور چلی گئیں، اور ساحل کی ریت اپنے چمکتے ہوئے لاکھوں ذرّوں کے ساتھ بدستور کسی محبوب کی منتظر رہتی ہے۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "اچھا عزیزا آج شام کو تم اس ہوس بوٹ کو امیرا کدل کے سامنے —— اس گھاٹ پر لے آنا۔ کل ہم ڈل پر چلیں گے۔"

"بہت اچھا صاحب۔"

عزیزا نے پُر مسرّت لہجہ میں کہا۔

زینی کا چہرہ بدستور آنچل کی اوٹ میں تھا۔

ہری سنگھ ہائی سٹریٹ کی طرف جاتے ہوئے (جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا) راستہ بھر انسانی زندگی کی حماقتوں پر غور کرتا رہا۔ حُسن کیا ہے اور انسان بدصورتی سے بھی زیادہ حسن سے کیوں متاثر ہوتا ہے؟ حَسین پھول جب مرجھا جاتا ہے تو اُسے آپ پاؤں تلے کیوں روند دیتے ہیں؟ اور کیوں ایک عورت پانچ بچے جننے کے بعد آپ کی تعریفی نگاہوں کی مستحق نہیں رہتی؟ یہ کیوں کر ہوتا ہے کہ ایک تنومند کسان دن بھر ایمانداری اور صدق دلی سے کام کرتا ہوا اور دن بھر خدا کو یاد کرتا ہوا بھی اپنے اور اپنے بال بچوں کیلئے نان و نفقہ مہیا نہیں کر سکتا۔ اور دوسری طرف وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے گناہوں اور ادبائیوں کا بارِ گراں لئے ہوئے میدانوں کی تپتی ہوئی فضاؤں کو چھوڑ کر اس

دلفریب وادی میں جنت کے مزے لوٹنے کیلئے آجاتے ہیں، اور پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ جن لوگوں نے اس دنیا میں غریب کی جنت ہتیالی وہ اگلی دنیا میں بھی اس کی جنت نہیں چھین لیں گے؟ تقدیر؟ تناسخ؟ رضا؟ اور پھر یہ تو زندگی کی حماقتیں ہیں ان کے بارے میں کچھ سوچا ہی کیوں جائے؟ کیا یہی کافی نہیں کہ زینی حسین ہے اور اس کا خاوند سوپور گیا ہوا ہے اور کل ہم اس کے ڈونگے پر سوار ہو کر ڈل دیکھنے جا رہے ہیں؟"

جب میں اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو سبھی میری رائے سے متفق نظر آتے تھے۔ گور بخش اپنی داڑھی کو کلپ لگاتے ہوئے بولا۔

"میں بھی چلوں گا۔"

بھیا لال بولا۔ "میرے خیال میں آٹھ دس روز تو گزر ہی جائیں گے۔ اور آخر اب یہاں سرینگر میں رکھا ہی کیا ہے کیوں سرفراز؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

محمود بولا۔ "کیوں بھئی میں بھی چلوں؟"

اب رہ گئے اِندر اور متّل، وہ دونوں بند کی طرف سیر کو گئے ہوئے تھے۔ جب واپس آئے تو انھوں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ کشمیر آ کر زندگی کی حماقتوں پر غور کرنا بنفسہٖ سب سے بڑی

حماقت ہے اور اس کا ازالہ صرف ایک ہی صورت میں ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ وہ بھی ڈُوکر کی سیر میں باقی احباب کا ساتھ دیں۔

گور بخش نے کہا۔

"آج رات ہم ڈونگے ہی میں بسر کریں گے۔ سب اسباب لے چلو۔ ہارمونیم، طبلہ، گراموفون، کیمرہ دوربین، بستر، مٹھائی، انڈے کیک پھل اور ہاں میں بھول گیا تھا، تم لوگ اپنے لئے حجامت کا سامان بھی لیتے چلو، اور ہاں بھئی سرفراز، تم وہاں سے اس کم بخت ڈونگے والے ہی کو بلا لاتے۔ اسی سے یہ سامان اٹھوا کر لے جانے کو کہتے"

"کوئی کم بخت آدمی اس ڈونگے کا مالک والک نہیں ہے بلکہ اس کی مالک تو ایک لڑکی ہے۔"

"لڑکی۔؟" سب نے یکایک چیخ کر کہا۔

"برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن "

لیکن انھوں نے مجھے شعر پورا نہ کہنے دیا، دوسرا مصرعہ زبان سے ادا ہونے سے پہلے ہی وہ مجھ پر وحشیوں کی طرح پل پڑے "ابے او گاؤدی۔" "ابے لگڑ بگڑ یا چرخ" "اس کا نام کیا ہے شکل کیسی ہے؟ بچہ جی بتلاتے ہو یا اپنا گلہ دبواؤ گے؟"

ہمیں سری نگر سے چلے ہوئے سات روز ہو چکے تھے اور
اب ہم اس دریائی زندگی سے بہت مانوس ہو چکے تھے، دِن رات
کھانے پکانے اور کھانا کھانے کے سوا اور کیا کام ہو سکتا تھا۔
ہاں کبھی کبھی بُرج کھیلتے اور کبھی کیرم،
ڈونگا اپنی دھیمی چال سے جہلم کی سطح پر بہتا جا رہا تھا۔ محمود
اکثر دوربین لگائے اُن دور کے اور بلند سلسلہ ہائے کوہ کی طرف
دیکھتا رہتا۔ جن کی چوٹیاں گرمیوں میں بھی برف پوش دکھائی دیتی ہیں۔
گور بخش ہارمونیم کے پردوں پر ہاتھ رکھے اپنے گلے سے
سریلی تانیں نکالتا اور بھیّا لال اپنے دبلے پتلے جسم اور لمبے قد کے
ساتھ بار بار ڈونگے کی چھت کو ہاتھ لگا کر ہم کوتاہ قدوں کی تضحیک
کر کے اپنی بدنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کرتا ——
اور زینی ؟ لیکن زینی کے تو ہم سب پرستار تھے، گو میں اپنا حق سب
پر فائق سمجھتا تھا اور یہ بات میں نے اپنے ساتھیوں پر اچھی طرح واضح
کر دی تھی۔ لیکن جلد ہی ہر ایک کو معلوم ہو گیا کہ یہ چڑیا کسی کے جال
میں پھنسنے والی نہیں،
اس کی ادائیں دِلربا تھیں، اس کے گیت دلکش، اسکی
مسکراہٹ دِل افروز، لیکن اسے اپنے خاوند سے محبت تھی اُسے

اپنے خاوند پر ناز تھا جو سوپور میں تلاشِ معاش میں مصروف تھا۔ جب وہ چپّو چلاتے چلاتے یکایک ہنس پڑتی تو یہ ہنسی ہم میں سے کسی کیلئے نہ ہوتی۔ عزیزا کیلئے بھی نہیں، جو اُسے اتنا پیارا تھا۔ پھر کبھی چپو ہاتھ سے چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو کر انگڑائی لیتی۔ اور پھر مغرب کی طرف دیکھنے لگ جاتی جدھر سوپور تھا۔ اس وقت گور بخش ایک بے سُرے لہجے میں چلّا اُٹھتا۔ "دلدار کمنداں والے دا ــــ دِلدار!۔"

بھیالال نے تو پہلے دن ہی زینی کو دیکھتے ہی کہہ دیا تھا۔ "گو شکل وصورت سے تو میں روایتی مجنوں ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ لیلیٰ مجھے محبت کی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتی، اور اس لیلیٰ پر ہی کیا موقوف ہے دنیا کی کسی لیلےٰ کو بھی میری چاہ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے' اے میری پہاڑی لیلےٰ! گڈ بائی۔"

لیکن بھیالال ہی پر کیا منحصر ہے، قریباً قریباً یہی حال ہر ایک کا تھا۔ شروع شروع میں گور بخش نے زینی کو ایک دو دن سریلے عشقیہ گیت سنائے تھے۔ اور کچن میں بیٹھ کر مچھلیاں بھونتے بھونتے اسے مچھلیوں کی ایک پلیٹ بھی پیش کی تھی۔ اور کبھی کبھی اِندر اور مَتّل پھلوں کے ٹوکروں میں سے سیب اور ناشپاتیاں چرا کر اُسے دے دیا کرتے تھے اور ہاں کبھی کبھی کیک کے ٹکڑے بھی۔ لیکن اب

چند دن سے یہ فیاضی بند کر دی گئی تھی۔ اور اب سب لوگ زینی کو قریباً بھول گئے تھے۔ اب وہ دن رات کھانا پکانا گانا ناچنا جہلم میں تیرنا اور اسی قسم کے کاموں میں منہمک رہتے تھے۔ ہر ایک چہرہ بشاش نظر آتا تھا، اور ان سات دنوں کے قلیل عرصہ ہی میں ہر ایک کو یہ محسوس ہونے لگا تھا۔ کہ اس کا وزن پہلے سے دُگنا ہو گیا ہے۔

بھیا لال نے اپنی پتلی کمر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ارے یار میں تو سچ مچ موٹا ہو رہا ہوں، اب یہ پتلون بھی مجھے کمر کے گرد تنگ معلوم ہوتی ہے۔"

اندر نے اپنے پچکے ہوئے گالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے گال اب پہلے سے پچکے ہوئے نہیں رہے۔"

رتنی بولا۔ "اب میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے چہرے پر سرخی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔"

محمود جو اشتراکی خیالات رکھتا تھا طنزیہ لہجہ میں بولا۔

"ہاں، انقلاب آ رہا ہے۔"

۵

انقلاب تو خیر ایک دور از کار بات تھی۔ لیکن اس میں

شک نہ تھا، کہ سوپور ضرور قریب آرہا تھا۔ کل وُلر اور پرسوں سوپور اور پھر شاید زینی کی یہ شوخ ادائیں ہمیں عمر بھر میتسر نہ آسکیں گی۔ میں کچن کے دروازے پر کھڑا ہو کر زینی کی طرف دیکھنے لگا۔ جو ڈونگے کے کنارے پر بیٹھی ہوئی چپو سے کشتی کا رُخ ٹھیک کر رہی تھی۔

ڈونگے کے دوسرے سرے پر کہیں عزیزا پسینے میں تر بتر ڈانڈ چلا رہا ہوگا۔" میں نے دل میں سوچا بیچارہ غریب گیارہ سال کا لڑکا لیکن پیٹ کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کچن کے عقب میں جو کمرہ تھا۔ وہاں محمود سویا پڑا تھا۔ اور اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز میرے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ کبھی کبھی ڈرائنگ روم سے ہنسی کی ایک بلند چیخ سنائی دیتی۔ اِندر نے برج کھیلتے وقت بُلف سے کام لیا ہوگا۔"

زینی نے کہا۔ "صاحب کل ہم وُلر پہنچ جائیں گے۔"

"جھیل وُلر کیا بہت خوبصورت ہے؟"

زینی سر ہلاتے ہوئے بولی "جی صاحب! جدھر نظر اُٹھاؤ پانی ہی پانی، تیرہ چودہ میل تک، چاروں طرف نیلا پانی اور بیچ میں کہیں کہیں کنول کے لاکھوں پھول کھلے ہوئے اور سری بٹ ناگ۔

"سری بٹ ناگ کیا؟"

"بٹ ناگ وُلر کا دیوتا ہے۔ وُلر کا بادشاہ ہے۔ وہاں ہر ایک سیاح کو چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان یا انگریز، کچھ نذر دینی پڑتی ہے۔"

"اور اگر وہ نہ دے؟"

"تو اس کی کشتی ڈوب جاتی ہے۔"

"اچھا..... تو کیا جھیل وُلر بہت خوبصورت ہوگی؟"

"صاحب خود دیکھ لیں گے۔"

"تم سے بھی زیادہ خوبصورت؟"

میں نے زینی کے قریب جاکر کہا۔

زینی کا چہرہ جو پہلے ایک سیب کے پھول کیطرح تھا۔ اب ایک گلاب کا پھول بن گیا، اس نے شرما کر اپنا منہ موڑ لیا۔

میں نے اپنی جیب سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا۔ اور زینی کے ہاتھ میں دیدیا۔ اور جذبات سے گلوگیر آواز میں کہا۔

"یہ لو اسے میری بٹ ناگ کی نذر کر دینا۔"

چند لمحے خاموشی رہی، پھر یک لخت زینی چپو چھوڑ کر تن کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ گلاب کا پھول ایک شعلہ بن گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں کانپتے ہوئے نوٹ کو زور سے اپنی مٹھی میں مسل ڈالا۔ اور پھر اسے تیزی سے پانی

میں پھینک دیا۔ زینی کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں نم دار ہو گئی تھیں اور بالوں کی ایک لٹ داہنے رخسار پر اُتر آئی تھی۔

یہ زینی کی دوسری تصویر ہے جو آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ میں آج بھی آنکھیں بند کئے چشمِ تصور سے اُسے ایک شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑک اُٹھتے دیکھ سکتا ہوں۔

میں دیر تک کچن کے دروازے کے قریب کھڑا رہا مجوب اور پشیمان، اپنی شکست کی زندہ تصویر، نوٹ چکر کاٹتا ہوا، پانی کی سطح پر بہہ رہا تھا۔ آخر اسے ایک مچھلی نے نگل لیا۔

آہستہ آہستہ آسمان کے مغربی حصہ میں شفق کی لالہ گوں لہریں غائب ہو گئیں اور رات کی سیاہ چادر پر تاروں کی افشاں چُن دی گئی۔ ان تاروں کی شوخ ہنسی گویا مجھ سے بار بار کہہ رہی تھی۔ کیوں کیا تم زینی کو بھی ایک مچھلی سمجھتے تھے۔ وہ مچھلی جو تمہارے پانچ روپے کے نوٹ کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر چپ چاپ نگل جاتی۔ لیکن وہ پانی کی مچھلی نہیں آدم کی اولاد ہے۔ اُسے اپنے بھلے بُرے کی تمیز ہے۔ وہ غریب ہے تو کیا ہوا وہ تمہارے روپوں کی محتاج نہیں۔ تم اسے نہیں خرید سکتے، کبھی نہیں خرید سکتے۔

دوسرے دن ہم وُلر کے کنارے پہنچ گئے۔ اور ہم نے

اپنے ڈونگے کو وہاں بند ھوایا جہاں دریائے جہلم جھیل وُلر میں داخل ہوتا ہے ـــــ حدِّ نظر تک ، سمندر کیطرح نیلا پانی پھیلا ہوا تھا ۔ اور دُور بہت دور چاروں طرف ایک سلسلہ کوہ ایک نیلگوں دیوار کیطرح نظر آرہا تھا ۔ مُرغابیوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ جھیل کے اوپر پرواز کر رہے تھے ۔ چار پانچ کشتیاں جھیل کی سطح پر بچوں کی ناؤ کی طرح کمزور اور بے کس سی نظر آرہی تھیں ۔ ہوا ساکن تھی ۔ ورنہ اگرچہ ہوا زور کی چل رہی ہوتی ، تو اس جھیل میں بیس بیس فٹ کی لہر کا پیدا ہونا مشکل نہ تھا ۔ اور پھر پانی کی ان طوفانی دیواروں کے آگے کشتیاں کہاں محفوظ رہ سکتی تھیں ۔

لیکن اگرچہ ھم سارا دن ایک کشتی میں بیٹھ کر جھیل میں گھومتے رہے ، ہوا بالکل ساکن رہی اور جھیل کی سطح نیلے رنگ کے شیشے کیطرح بالکل شفاف اور غیر متحرک ، ہم نے سری بٹ ناگ دیکھا ۔ یہ ایک بہت بڑا بھنور تھا جو جھیل کی مغربی سمت میں ایک گول دائرہ بناتا ہوا گھوم رہا تھا اور بہت خوفناک معلوم ہوتا تھا لیکن ہم نے کشتی کے ملاحوں کے کہنے پر بھی وُلر کے اس بے تاج بادشاہ کو ایک پیسہ تک نذر دینا گوارا نہ کیا ۔ اور پھر ھم نے سری بٹ ناگ کا ایک وزیر بھی دیکھا جو ایک چھوٹا سا بھنور تھا ۔ اور پہلے

بھنور سے قریباً چار میل کی دوری پر واقع تھا. البتہ یہاں گوربخش نے جو تیرنا کم جانتا تھا۔ ایک دو ناشپاتیاں وزیر کی نذر کیں. جو خدا جانے کتنے دنوں سے بھوکا تھا. کیونکہ ملاحوں کے کہنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ آخری حادثہ آج سے دو مہینے پیشتر تین انگریزوں کو پیش آیا تھا۔ جو اس جھیل میں کشتی چلاتے چلاتے ان طوفانی لہروں کا شکار ہو گئے. جو فی الفور ایک تیز جھکڑ کے چلنے سے پیدا ہو گئی تھیں.

سہ پہر کے بعد جب ہم جھیل کی سیر سے لوٹے تو زینیؔ اور عزیزاؔ دونوں کو زار و قطار روتے ہوئے پایا. پوچھنے پر پتہ چلا کہ زینی کا خاوند سوپور سے پنجاب چلا گیا ہے. روزگار کی تلاش میں. ایک آدمی سوپور سے آیا تھا. وہ اِدھر سے گزر رہا تھا اور اس سے پوچھنے پر یہ سب حال معلوم ہوا.

ہم نے زینیؔ اور عزیزاؔ کو جہاں تک ہو سکا تسلّی دینے کی کوشش کی لیکن ان کے آنسو تھمنے ہی میں نہ آتے تھے. وہ اپنے آپ کو بالکل بے یار و مددگار پاتے تھے. اور بچوں کی طرح روئے جا رہے تھے.

طبیعت بہت عرصہ تک کبیدہ رہی. یہ لوگ کتنے بیوقوف ہیں. رونے سے کیا ہوتا ہے؟ اور پھر کیا اس بیوقوف کشمیری کو

اس کے اپنے وطن میں کوئی کام نہیں مل سکتا تھا ؟ پنجاب میں اسے کیا قارون کا خزانہ مل جائے گا ؟

گدھے ؟ بیوقوف غریب، ان میں عقل تو بالکل نہیں ہوتی محض بوجھ اُٹھانا جانتے ہیں، خچروں کیطرح، انھیں انسان سمجھنا ہی حماقت ہے۔ ان کیساتھ خچروں کا سا ہی سلوک ہونا چاہیئے۔ غریب لوگ غریب ہی رہیں تو ٹھیک طرح کام کرتے ہیں۔ اگر انھیں پیٹ بھر کر کھانا ملنے لگے تو اکڑ جاتے ہیں۔ غرضکہ طبیعت بہت منغّض رہی۔

ہم سب لوگ اپنے آپ کو قصوروار سمجھ رہے تھے۔ اور یہ احساس ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ آخر کھانا کھانے کے بعد بھیالال کے لطیفوں سے طبیعت کسی قدر بہلی۔ گوربخش نے گراموفون پر چند دلکش ریکارڈ سنائے۔ اور ہماری محفل پھر قہقہوں سے گونج اُٹھی۔

دس بجے کے قریب جب "برج" شروع کی گئی، تو میں دردِ سر کا بہانہ کر کے اُٹھ آیا۔ دراصل میں برج کھیلنا نہیں چاہتا تھا۔ پہلے میں سونے کے کمرے میں گیا۔ پھر میں نے کچن میں جا کر پانی کا ایک گلاس پیا۔ لیکن طبیعت میں بے کلی بدستور موجود تھی۔ میں کچن سے ہوتا ہوا باہر ڈونگے کے کھلے فرش پر آ گیا۔

زینی ہاتھ میں چپو لئے ہوئے جھیل کے نیلے پانی کیطرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ڈونگے کے کنارے پر بیٹھی تھی۔ اور اس کے قدموں میں عزیزا لیٹا ہوا تھا۔ نہیں، وہ رو رو کر سو گیا تھا۔ اس کی پلکوں پر آنسو ابھی تک چمک رہے تھے۔ اس کے لبوں سے اب بھی کبھی کوئی سینے میں دبی ہوئی سسکی نکل جاتی تھی۔

اور زینی — وہ کیا سوچ رہی تھی — ؟ کیا اس کی نظر جہلم کی وسعتوں سے پرے پنجاب کے میدانوں تک پہنچ رہی تھی جہاں اس ظالم پردیس میں شاید کسی لکڑی اور کوئلے کی دکان کے آگے اس کا خاوند لیٹا ہوا تھا. دن بھر کی محنت ومشقت سے چور۔ ایک تھکے ہوئے خچر کیطرح ہانپ رہا تھا۔ زینی کا چہرہ اداس تھا. اس آنکھیں جیسے خلا میں کچھ دیکھ رہی ہو

" زینی !" میں نے آہستہ سے کہا.

وہ خاموش بیٹھی رہی.

" مجھے بہت افسوس ہے زینی۔"

زینی کا سینہ زور زور سے حرکت کرنے لگا.

" زینی تم گھبراؤ نہیں ۔" میں نے آہستہ سے کہا.

" صاحب، اب ہم کیا کریں گے ؟ " زینی نے گلوگیر لہجہ میں کہا۔ " اب ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں — ایک خاوند تھا۔ وہ پردیس چلا گیا.

" عزیزا چھوٹا سا بچہ ہے . . . . .

" میں عورت ذات ہوں . . . .

" ہائے اب کیا ہو گا ؟ "

زینی کی سسکیاں تیز ہوتی گئیں، میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔

"کیوں گھبراتی ہو، زینی تمہارا خاوند ضرور پردیس سے واپس آجائے گا۔ اور —"

زینی نے روتے ہوئے کہا۔ "صاحب میں مر جاؤں گی اور چھوٹا عزیزا بھی بھوکا مر جائے گا۔ اس نے ہمیں دھوکا دیا۔"

"مت گھبراؤ زینی، میں تمہارے لئے ..... میرا مطلب ہے میں تمہاری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہوں۔ ہاں تم روتی کیوں ہو؟ میری اچھی زینی، مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے، بے اندازہ محبت میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں ....."

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ میں پانچ روپے کا ایک نوٹ تھما دیا۔ جیسے چراغ بجھنے سے پہلے شعلے کی ایک بلند، لپک پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح زینی کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک پیدا ہوئی۔ لیکن پھر فوراً ہی بجھ گئی تیل ختم ہو چکا تھا اور پھر غریبوں کے پاس سرمایہ ہوتا ہی کہاں ہے۔ زینی ایک ٹوٹی ہوئی بیل کی طرح میری آغوش میں گر پڑی۔ اور اس نے اپنے آنسوؤں سے تر چہرے کو میرے بازوؤں میں چھپا لیا — اور زور زور سے سسکیاں لینے لگی۔

چاند کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ ستارے نادم تھے۔ وہ جہلم کی سطح پر باسی پھولوں کیطرح دکھائی دے رہے تھے۔ ہوا کنول کے پتّوں کے قریب سے گزرتی ہوئی آہیں بھر رہی تھی۔ کائنات کا ہر ذرّہ سر جھکا کر اداس لہجہ میں کہہ رہا تھا۔ تم نے ہمیں خرید لیا۔ صرف ڈرائنگ روم سے گور بخش کے گانے کی بلند آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ جھوم جھوم کر گا رہا تھا۔

اگر فردوس بر روئے زمیں است !!
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است !

بے رنگ و بو

سکھ دکاندار نے جو آٹا نون تیل بیچتا تھا۔ آہستہ سے کہا
" میرے مکان میں تھوڑی سی جگہ خالی ہے۔ آپ خود چل کر دیکھ لیجئے۔ کرایہ بھی کم ہے صرف نو روپیہ ماہانہ، میں خود آپ کے ساتھ گلی میں چلتا ہوں۔"

سکھ دکاندار نے سائیکلوں کی دکان کے مستری کو آواز دی۔" او رحمو! او رحمو! ذرا میری دکان کا خیال رکھنا"

" کوئی فکر نہ کرو سردار صاحب۔"

سکھ دکاندار جہاں رہتا تھا وہ چھوٹا سا مکان تھا۔ ایک ہی منزل، ایک ہی نہانے کا کمرہ، سیڑھیوں کے قریب ایک چھوٹا سا تنگ کمرہ خالی تھا اور اس کے ساتھ ہی اندر کی طرف کھلتا ہوا

"ایک چھوٹا سا آنگن۔

"بس، اس چھوٹی سی جگہ کیلئے نو روپیہ ماہانہ کرایہ۔"

سکھ دکاندار نے ایک پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"تو اور کیا، ہم بھی نو روپیہ ہی دیتے ہیں۔ بجلی، پانی کے نل کا کرایہ ملا کر بارہ روپے ہو جاتے ہیں، مہینہ بھر میں بمشکل تیس پینتیس روپیہ کماتا ہوں، بارہ روپیہ مالکِ مکان کو دے دیتا ہوں۔ آٹھ دس روپیہ حکیم صاحب کی نذر کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں، بیوی بچوں والے گھر میں آٹھ دس روپے کچھ زیادہ نہیں، باقی ...... بمشکل سے گذر ہوتی ہے۔"

سکھ دکان دار کی زرد رو بیوی الگنی پر دھلے ہوئے فراک لٹکانے کو نکلی۔ ایک بچہ اس کی دھوتی کا گوشہ پکڑے روئے جاتا تھا۔ ایک بچہ وہ گود میں اٹھائے تھی جو اپنے ننھے ہاتھوں میں کھانڈ کے بتاشے پکڑے ہوئے تھا۔ ایک بچہ اس کے پیٹ میں تھا۔

سکھ دکان دار نے کھانستے ہوئے کہا۔ "تو یہ گھر آپ — آپ کو پسند نہیں؟"

"جگہ تو اچھی ہے، لیکن ذرا ——— اس کمرے میں اندھیرا بہت ہے۔"

سکھ دکاندار کی کھانسی تیز تر ہوتی گئی۔ آخر رک رک کر بولا۔

"ہاں...... اندھیرا...... اندھیرا، نو روپے ماہانہ میں اندھیرا نہ ملے گا تو اور کیا روشنی مل سکتی ہے۔"

یہ گلی پکی تھی، صاف ستھری، سہ منزلہ مکان، دُہرے دروازے مچھروں اور مکھیوں کو روکنے کیلئے جگہ جگہ قہقہوں کی آوازیں، گراموفون کے ریکارڈ، ہارمونیم کی صدائیں، ایک مکان دیکھا، بہت بڑا مکان سرخ سیمنٹ کا فرش، تین چار کرایہ دار پہلے ہی سے رہتے تھے۔ صرف ایک حصہ جو دو کمروں پر مشتمل تھا، خالی تھا کرایہ پندرہ روپے۔

مجھ سے کسی نے کہا۔ "مالکِ مکان عقب کی گلی میں رہتے ہیں۔ آپ ان سے معاملہ طے کر لیجئے۔"

عقب کی گلی کے آخری کونے پر جنوب کی طرف ان کا مکان تھا۔ گھنٹی بجائی تو ہنستے ہوئے باہر نکلے۔

"نمستے۔"

"جی نمستے، آپ اس (ہاتھ سے اشارہ کر کے) کمرے میں تشریف رکھئے میں ابھی کھانا ختم کر کے آتا ہوں بس میں ایک منٹ میں آجاؤں گا۔ مجھے دفتر بھی جانا ہے۔"

دوسرے کمرے میں ایک تنگ پرانی وضع کے صوفے پر جس پر
نیلی چھینٹ کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ بابو صاحب کی بیوی لیٹی ہوئی تھی۔
"مجھے زکام ہے معاف کیجئے گا میں اُٹھ نہیں سکتی۔"
مالکہ مکان نے لیٹے لیٹے اور کشمیری شال کو اپنے گرد لپیٹتے
ہوئے کہا۔
میں نے مسکرا کر کہا۔ "کوئی ہرج نہیں، مجھے بھی زکام ہے۔"
ہم دونوں ہنسنے لگے، بابو صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔
ہمیں ہنستے ہوئے دیکھ کر ان کے منہ کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔
"آپ نے مکان دیکھ لیا؟ پسند ہے؟" ان کے لہجہ
میں خفیف سی درشتی تھی۔
"دیکھ لیا، پسند ہے۔"
"کرایہ ہر مہینہ ہم پیشگی لے لیتے ہیں۔"
"اچھی عادت ہے۔"
لیکن "بابو صاحب۔ "میری بات پر ہنسے نہیں۔ بولے
کیا آپ شادی شدہ ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ آپ اکیلے تو نہ
ہوں گے، آپ کے ساتھ عورتیں ہوں گی، اور بچے بھی دیکھ
نا یہاں سب شریف لوگ رہتے ہیں۔"

وہ ان دو فقروں میں اپنی معاشرت کی پوری داستان کہہ گیا۔

"یہاں ، جس مرد کے پاس عورت نہیں اس کی نہ تو مکتی ہو سکتی ہے اور نہ اسے کوئی مکان کرایہ پر مل سکتا ہے۔ اور جس عورت کے پاس بچے نہیں اس کا خاوند دوسرا بیاہ کر لیتا ہے اور اگر دوسری عورت بھی بچے نہ جنے تو تیسرا بیاہ ....

میں نے انکار میں سر ہلایا۔

بابو نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے سر ہلایا۔ "معاف کیجئے گا۔ یہ بہو بیٹیوں والا محلہ ہے۔"

بابو کی بیوی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ دروازے کے قریب ایک جوان لڑکی بغل میں کتابیں لئے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے گال تمتما گئے۔ اونچی آواز میں بولی۔

"رے منڈو جلدی کرو کالج دیر ہو گئی۔"

"آیا بی بی جی" نوکر ہنستا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا۔ کوئی سولہ سترہ برس کا ہو گا، بھیگی بھیگی مَسیں سڈول اعضاء

یہاں ریت اُڑ رہی تھی۔ اور شور مچاتے ہوئے لڑکے ایک دوسرے پر مٹی پھینک رہے تھے۔ ننھی منّی لڑکیاں ریت پر بطخوں کیطرح چلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یا ایک لمبی رسی پر کودنے کی کوشش میں مشغول تھیں۔ بھنے ہوئے چنے بیچنے والا پاس انگیز نگاہوں سے بچوں کیطرف دیکھتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس ریتلے میدان سے پرے دور سامنے ایک مکان پر موٹے حروف میں لکھا تھا: "کرایہ کیلئے خالی ہے۔"

دروازہ کھلا تھا، ایک چھوٹا سا دالان، اس کے آگے کھلا آنگن، جس میں پانی کے نل کے نیچے بیٹھی ہوئی ایک بدصورت فربہ اندام عورت نہا رہی تھی۔ بغیر کسی جھجک کے بولی۔ "آپ مکان دیکھنے آئے ہیں"

میں نے دل میں کہا۔ "اور کیا تمھیں دیکھنے آیا ہوں؟"

جیسے اس نے میرے دل کی بات سمجھ لی ہو۔ بولی۔ "اچھا آپ ذرا دالان میں ٹھہریئے میں بھی آتی ہوں۔"

وہ ایک سفید دھوتی پہنے ہوئے آئی۔ یہ سونے کا کمرہ، یہ بیٹھک، یہ ایک اور کمرہ، یہ بھی ایک کمرہ ہے۔ یہ رسوئی ہے، ذرا نا صاف ہے لیکن کل تک بالکل ــــ (سر ہلا کر) ہو جائے گی۔ کرایہ بیس روپے ہم پیشگی لیتے ہیں۔ اچھے کرایہ داروں کو دیتے ہیں۔ دوسری منزل میں ایک رائے صاحب کے "گھر والے" رہتے ہیں۔ ان کی تین لڑکیاں

ہیں، کالج میں پڑھتی ہیں، تیسری منزل میں ایک پروفیسر صاحب اور ان کی بیوی اور بچے . . . .

میں نے پوچھا۔ "اور تیسری منزل سے اوپر ؟ "

وہ حیران ہو کر بولی "تیسری منزل سے اوپر ؟ ـــ اس سے اوپر چھت ہے، سونے کیلئے کھلی جگہ، اور ایک طرف رفع حاجات کے لئے تین کمرے . ."

"ہوں !" میں نے کچن کے فرش کو ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا . "یہ فرش ذرا ناصاف ہے، کل تک ـ دُسر ہلا کر ـــ"

پھر میری طرف دیکھ کر بولی . "آپ شادی شدہ ہیں نا ؟ "

" نہیں، لیکن میرے ساتھ میری خالہ ہونگی، اور خالہ کی لڑکی اور خالہ کی لڑکی کی لڑکیاں ."

"اوہ، اچھا ـــ پھر تو ٹھیک ہے لیکن کرایہ پیشگی دینا ہوگا . کم ازکم ایک دو مہینوں کیلئے، کئی کرایہ دار بغیر کرایہ ادا کئے رخصت ہو جاتے ہیں . "

"ہاں، بہن تمھیں ابھی پچھلے مہینے ہی آٹھ روپے کا نقصان اُٹھانا پڑا . "

اب یہ ایک نوجوان عورت پیچکے سے کہیں سے نکل آئی تھی

اچھے نقش تھے لیکن چہرہ کچھ اُترا ہوا کچھ اُداس سا، بڑی بڑی آنکھیں لیکن ملول، رنجیدہ، لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ، لیکن پھیکی، تاسف انگیز گویا کہہ رہی تھی، اس سے کیا فائدہ، وہ دن بھر دفتر میں کلرکی کرتے ہیں اور میں لبوں پر سرخی لگا کر برتن مانجھتی ہوں، آخر اس زندگی سے کیا فائدہ وہ شام کو تھکے ماندے آتے ہیں اور پھر دفتر کے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں اور رات کو — میرے لبوں کی سرخی دیکھتا ہی کون ہے؟ ہائے یہ زندگی کس قدر پھیکی اور بے مزہ ہے۔

"یہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں" مالکہ مکان نے مجھے بتایا ان کے — بجلی کے دفتر میں نوکر ہیں۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "جی، بہت اچھا، نمستے جی۔"

کلرک کی بیوی نے خوش ہو کر کہا۔ "آپ — یہ مکان کرایہ پر لے رہے ہیں۔"

"جی سوچ رہا ہوں، میرے ساتھ خالہ ہوں گی، خالہ کی لڑکی خالہ کی لڑکی کی لڑکیاں۔ اور . . . . . ."

"تو ہرج ہی کیا ہے؟" اس نے خود بخود ہنستے ہوئے کہا۔ "ہم سب بہنیں مل جل کر گزارہ کر لیں گی۔ گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے نا، اور پھر یہ بڑا اچھا مکان ہے۔" اس نے کچن کے فرش کو پاؤں

سے بجاتے ہوئے کہا۔

"یہ فرش ذرا نا صاف ہے۔" بدصورت فربہ اندام عورت ایک کل کیطرح بول اٹھی۔ "کل تک (سر ہلاکر) ——"

میں آہستہ آہستہ باہر دالان کیطرف مڑنے لگا۔ نوجوان عورت کی آنکھیں کہہ رہی تھیں، کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم یہ مکان لے لیتے۔ مجھے تمہاری محبت تو درکار نہ تھی۔ اور میں اس قسم کی باتوں کو پسند بھی نہیں کرتی لیکن یونہی دل بہلا رہتا۔ وہ دن بھر دفتر میں رہتے ہیں صبح سے شام تک۔ تم کبھی کبھی کنکھیوں سے مجھے دیکھ لیا کرتے۔ اور میرے لبوں کی سرخی چمک اٹھتی۔ کیا ہی اچھا ہوتا، افسوس یہ زندگی کتنی پھیکی اور بے رنگ و بو ہے۔"

"میں کل تک آپ کو پتہ دوں گا، نمستے۔"

"نمستے!" دونوں عورتوں نے کہا۔

٭ ٭ ٭

ریتلے میدان میں ایک گوری رنگت کا مزدور لکڑیاں چیر رہا تھا۔ کھٹ کھٹ، کھٹا کھٹ، مجھے گزرتے دیکھ کر رُک گیا۔

"سلام صاحب۔"

"سلام! کہاں کے رہنے والے ہو، کشمیری ہو؟"

"نہیں، صاحب، کلّو کا گدی ہوں۔"

گورا رنگ، تنے ہوئے پٹھے، بہت میلی نکر، پھٹی ہوئی قمیص کشادہ چھاتی۔ اور ہاتھ میں ایک مضبوط کلہاڑی۔"

"کلّو، کلّو؟"

"جی سرکار۔"

"بیوی ہے؟"

گدی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "جی سرکار"۔ بیوی کے نام پر ہر ہندوستانی کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے، کیا ہوا اگر وہ غلام ہے کم از کم اس کا بھی تو ایک غلام ہے۔"

گدی اپنی خوش قسمتی پر نازاں مسکرا رہا تھا۔ اس کے بڑے بڑے میلے دانت سرخ مسوڑھوں میں نقلی طور پر جڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

"بچے بھی ہوں گے؟"

"جی سرکار ایک لڑکا ہے۔ ننھا سا (ہاتھ سے اشارہ کر کے)، اتنا سا۔"

"انھیں بھی ساتھ لائے ہو؟"

گدی کی مسکراہٹ جیسے کسی نے پاؤں تلے مسل دی ہو۔
اس نے آہستہ سے انکار میں سر ہلا دیا۔ بولا۔ "صاحب کوئی کام دیجئے میں لکڑیاں خوب چیرتا ہوں۔"

"ایک من کا کیا لیتے ہو؟"

"ایک آنہ!"

"ایک آنہ؟ صرف ایک آنہ؟ ارے — صرف ایک آنہ؟ آدھے دن کی کمائی۔"

"سرکار لوگ ایک آنہ بھی نہیں دیتے۔"

"تم واپس کلّو کب جاؤ گے؟"

لکڑی چیرنے والا ریت پر بیٹھ گیا۔ اور حقہ پینے لگا شاید وہ دھوئیں کے حلقوں میں کلّو کے سرسبز مرغزار، برفانی چوٹیاں کالی سلیٹ کی چھتوں والے گاؤں اور اپنی بیوی اور ننھے بچے کی تصاویر دیکھ رہا تھا۔

میں آگے بڑھ گیا۔ لکڑہارے نے یاس انگیز لہجہ میں کہا۔

"صاحب، کوئی کام بتائیے!"

⁂ ⁂ ⁂

شام کو میں پھر اپنے سرائے نما ہوٹل کے دروازے پر

واپس پہنچ گیا۔ قید خانے کیطرح تنگ کمروں کی قطاریں، بھنی ہوئی پیاز کی بُو، بڑے سے آنگن میں بے ترتیبی سے بچھے ہوئے بنچ۔ آٹھ دس لڑکوں کے مجمع میں راج ہنس چلاّ چلاّ کر کہہ رہا تھا۔

"ہم انقلاب چاہتے ہیں انقلاب، بورژوا، عمومی انقلاب اور پھر اشتراکی انقلاب اور پھر خالص سو فیصدی مارکسی انقلاب ہم ایک نئے تمدن، ایک نئی تہذیب، ایک نئی معاشرت کی بناء پر ایک نئے انسان کی تخلیق چاہتے ہیں ہم ..... "بیچارہ راج ہنس.

مطبخ کا ملازم میرے قریب سے گزر گیا۔

میں پکارا۔ "او دینے! آج کیا پکا ہے؟"

"ساگ، دال اور کانسٹی پھل۔"

۹۷ نمبر میں رہتے والا برہمن لڑکا رام نام کی دھوتی پہنے باتھ روم میں نہانے جا رہا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور بستر پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

راج ہنس اپنی پتلی آواز میں اب تک چلاّ رہا تھا۔ "ہم اس استعماری نظام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ اسے پیس کر دھر دیں گے۔ اس کے پرخچے ....."

بھیالال کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے اداس لہجہ میں پوچھا۔ "تم نے مکان لے لیا؟ اب تم ہمیں چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ اپنے سب رفیقوں کو!"

میں نے جواب دیا۔

"میرے لئے یہ سرائے ہی بہتر ہے۔"

آنسوؤں والی

ہم دونوں تریٹ کے ڈاک بنگلے میں آرام کرسیوں
پر لیٹے اونگھ رہے تھے۔ آتش دان میں لکڑیاں چٹخ رہی تھیں۔ اور
بند دریچے کے شیشوں میں سے میں برف کے ان بڑے بڑے
سفید گالوں کو دیکھ سکتا تھا۔ جو سیب کے پھولوں کی طرح خوبصورت
تھے۔ اور نہایت خاموشی سے دریائے جہلم میں گر رہے تھے۔
جہلم میں پانی ہر لحظہ بڑھ رہا تھا۔ دریا کے کناروں پر درخت برف کا
سفید لبادہ اوڑھے چپ چاپ کھڑے تھے۔ چاروں طرف
ایک عجیب خاموشی، ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ شاید ہم کسی پریوں کے ملک میں آ گئے ہیں۔
میرا ساتھی جو انجنیئر تھا۔ یکایک آرام کرسی پر اُٹھ بیٹھا

اور میری طرف جھک کر کہنے لگا۔ "کیوں دوست کیا تمھیں جادو، سحر و افسوں اور اس قسم کی باتوں پر یقین ہے؟"

میں نے خوابیدہ انداز میں سر ہلا دیا۔ انجنیئر کا چہرہ بھولے بسرے مگر پُر مسرت ایّام کی یاد سے چمک اٹھا۔

اس نے ایک سگار سلگا لیا اور کہنے لگا۔ میں تمھیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔

"ایک دفعہ مجھے سہرہ اور گاٹیاں کے درمیان جموں کے علاقے کیطرف، ایک خراب اور کچی سڑک کا معائنہ کرنے کیلئے جانا پڑا۔ یہ سڑک پہاڑوں کو کاٹ کر نئی نئی بچھائی گئی تھی۔ اور مجھے جلد از جلد معائنہ کر کے اس کے متعلق اپنے افسروں کو مطلع کرنا تھا کہ آیا یہ سڑک خشک موسم میں موٹروں کی آمد و رفت کے لئے موزوں ثابت ہو سکے گی یا نہیں۔

افسر لوگ بھی اس سڑک کے لئے بہت بے قرار نظر آتے تھے۔ کیوں کہ یہی وہ سڑک تھی جو گاٹیاں کی خاموش اور پُرسکون وادی کو باہر کی دنیا اور اس کی تہذیب سے ملا رہی تھی۔

یہ سڑک کوئی ایک سو ستر میل لمبی ہوگی اور سہرہ سے گاٹیاں تک جاتی تھی۔ میں نے اپنا معائنہ سہرہ سے شروع کیا۔

سہرہ ایک خوشنما جگہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی گول گول پہاڑیاں
چوٹیوں پر کہیں صنوبر کے درخت آسمان کی شفاف اور نیلی سطح پر سیاہ
سائے بناتے ہوئے، پہاڑیوں سے نیچے اتر کر ایک سبز اور شاداب
سطح مرتفع اور اس پر چند ایک بھوری بھوری جھونپڑیاں جو آفتاب کی
کرنوں میں کندن کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہاں سہرہ واقعی ایک اچھی
جگہ تھی اور میں نے اُسے بہت پسند کیا۔ سوائے سہرہ کی چنگی کے
جہاں کے افسر مجھے نہیں جانتے تھے۔ اس لئے انھوں نے مجھے دق
کرنا ہی مناسب سمجھا کہ ایک محالدار مجھ سے کہنے لگا۔ صاحب آپ کے
اس ہیٹ پر بھی محسوس لگے گا۔ میں نے کہا۔ "بھئی یہ تو پہننے کی چیز
ہے۔" وہ بولا۔ "ہاں ہے تو سہی، لیکن بالکل نئی نظر آتی ہے۔
دراصل چنگی کے افسر پہننے کی چیز اسے سمجھتے ہیں جو نئی نہ دکھائی دے
نہ دُھلائی گئی ہو، بلکہ اچھی خاصی گندی اور ناصاف ہو۔ محصول صرف
اسی صورت میں معاف ہو سکتا ہے۔

خیر ہم سہرہ سے کوئی دس بجے کے قریب آگے
چلے، اب ہمارے سامنے وہ سڑک تھی۔ جو پیچ در پیچ بل کھاتی ہوئی
نئے اور اجنبی علاقوں میں سے گزرتی تھی۔ مجھے اس بات کا احساس
ہوا کہ میری کار بھی پہلی مرتبہ اس علاقے میں داخل ہو رہی تھی اور

اس سے مجھے یک گونہ مسرت حاصل ہوئی۔

میں نے شوفر سے کہا۔ کہ گاڑی آہستہ آہستہ چلائے۔ کیونکہ اوّل تو مجھے معائنہ کرنا تھا۔ پھر سڑک بھی اکثر مقامات پہ بہت تنگ تھی۔ کہیں کہیں کناروں پر گہری کھائیاں آجاتی تھیں۔ جن کی طرف دیکھنے سے بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، اور اکثر موڑ بہت غلط طریق پر کٹے ہوئے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔ میلوں ہی آگے، سڑک کا معاینہ کرتے ہوئے قدرت کی دلفریبیوں کی بہار دیکھتے ہوئے۔ دور اوپر آسمان میں چیلیں پر تولے ہوئے گھوم رہی تھیں۔ نیچے زمین پر لمبی لمبی کھیتیاں پہاڑوں کے دامن سے شروع ہوتیں اور پھر کسی پرانے قلعے کی سیڑھیوں کیطرح اوپر ہی اوپر چڑھتی چلی جاتیں۔

کبھی کبھی کوئی وسنت کا درخت اپنے سرخ سرخ پھولوں کی شمعیں لٹکائے ہماری موٹر کے قریب سے دوڑتا ہوا گزر جاتا۔ ایک جگہ ہمیں ایک چھوٹی سی ندی کو عبور کرنا پڑا۔ جہاں کم بخت سب انجینئر پُل تو کیا ایک DIVERTION تک بنانا بھی بھول گیا تھا۔ ہم نے اس چھوٹی سی شور مچاتی ہوئی ندی کو کار کی پوری رفتار سے عبور کیا۔ پانی میں سے گزرتے وقت انجن سے نغمے نکلنے لگے۔ اور

گاڑی کے پہیے چھوٹے چھوٹے پتھروں پر ناچتے ہوئے گزر گئے۔ موسم خزاں کا تھا لیکن یہاں کی خزاں بھی کتنی حسین تھی۔ کشمیر میں گاٹیاں سے زیادہ خوبصورت وادی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔

میں نے خزاں میں بہار کے گیت گائے۔ میں نے اپنے شوفر کو گاڑی اچھی طرح چلانے پر مبارکباد دی، میں نے ——

یکایک ایک دھچکا سا لگا، جس سے ساری کار کانپ اُٹھی۔ پھر ایک اور دھچکا اور اب کار وہیں کی وہیں کھڑی ہو گئی۔ خاموش اور چپ چاپ، صرف انجن ہی ایک بچھڑے ہوئے بھیڑ کے بچے کی طرح چلا رہا تھا۔

ہم کار سے اُترے، میں اور میرا ہوشیار ڈرائیور، ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سے ہم نے دیکھ لیا کہ کار کو کیا حادثہ پیش آیا تھا چپ چاپ یہ کم بخت کچی سڑک درمیان میں سے بیٹھ گئی تھی۔ اد کار کے پچھلے بائیں پہیے کو اپنی جگہ سے ہلا گئی تھی۔ میں نے ڈرائیو کہا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ہمیں یہیں سردی میں رات بھر ٹھٹھر ہو گا۔" اتنا کہہ کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اسی وقت مجھ پر وہ احساس طاری ہوا جسے آپ سحر یا جادو یا افسوں، جو جی چاہے کہ کر پکار سکتے ہیں۔"

یہ ایک تنگ وادی تھی جس کے دونوں طرف نیم دائرہ بناتے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ کھڑے تھے۔ وادی کے عین درمیان پہاڑوں کو چیر کر ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ اس کا پانی ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں ایک سونے کی لکیر کی طرح چمک رہا تھا۔ ہمارے بالکل قریب ہی دیودار اور شاہ بلوط کے درخت کھڑے تھے۔ خاموش، چپ چاپ، جنگل کے سپاہی جو شاید عشق و محبت کے وہ حیرتناک فسانے سن رہے تھے جنھیں مغربی ہوائیں دور دور کے ملکوں سے اڑا کر لائی تھیں۔ پرے جنگل کے قریب ایک خوبصورت گھر تھا۔ چکنی مٹی کا بنا ہوا۔ اور سپید کھریا سے لپا ہوا۔ اس کے قریب ہی نیچے سڑک کی طرف، ایک عالیشان چنار اپنے بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ جس کے گھنے سائے میں ایک ٹھنڈا چشمہ گنگنا رہا تھا۔

اِس حسین منظر نے مجھ پر ایک بیخودی کی کیفیت طاری کر دی۔ اور میں وہیں سڑک کے درمیان کھڑا رہ گیا۔ پھر یکایک ڈرائیور کے یہ تلخ الفاظ میرے کانوں میں گونج اُٹھے۔

"صاحب افسوس ہے، مگر ہم آج آگے نہیں جا سکیں گے۔"

میں نے یہ سن کر منہ موڑ لیا اور چشمہ کیطرف چل پڑا۔

چشمے کا پانی بہت ٹھنڈا اور صاف تھا۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا

اور خوب سیر ہو کر پیا۔ اس کی جاں بخش تازگی نے اس درد کو بھی دور کر دیا جو سفر کی تکان کی وجہ سے میری کن پٹیوں میں پیدا ہو گیا تھا۔

"پانی ٹھنڈا ہے راہی۔" ایک نازک آواز آئی۔

میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا ایک عورت تھی جو اپنے داہنے بازو اور کمر کے درمیان ایک مٹی کی ٹھلیا تھامے تھی۔ اسطرح جیسے کوئی ماں اپنے ننھے بچے کو تھامے ہوئے ہو۔ وہ کسی قسم کی آہٹ پیدا کئے بغیر ایک وحشی ہرنی کیطرح یہاں چشمے کے کنارے پہنچ گئی تھی۔ اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھی ایک ہرنی کی سی وحشت اور نرمی پائی جاتی تھی۔

میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور تعظیم کے طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ "جی ہاں پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا ہے ایسا چشمہ تو میں نے اس علاقے میں کہیں نہیں دیکھا۔"

اس نے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھا اور پھر سر ہلا کر بولی۔ "تم مجھے اس علاقے کے رہنے والے معلوم نہیں ہوتے"۔

میں نے مسکین لہجے میں کہا۔ "کاش کہ ایسا ہوتا۔"

اس کے پتلے پتلے لبوں پر ایک لرزش سی پیدا ہوئی کہنے لگی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے جو اس جنگل کا رہنے والا نہیں ہے وہ

اس جنگل کا رہنے والا کیسے ہو سکتا ہے ؟"

میں نے شرم سے اپنا سر جھکا لیا اور اس کے نازک ٹخنوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ننگے پاؤں کی طرف، بلاشبہ میں اس جنگل کا رہنے والا نہیں تھا.

وہ کچھ عرصہ خاموش رہی. پھر اس نے نیچے سڑک پر کھڑی ہوئی کار دیکھ لی۔ " وہ کیا ہے، کیا یہ وہی چیز تو نہیں جس کے متعلق میرے بابا نے کہا تھا کہ ایک دن یہاں آئے گی اور اس سب علاقے پر قبضہ کر لے گی۔"

میں نے وحشی ہرنی کو سمجھانے کی کوشش کی

جب وہ میری باتیں سن چکی تو سر ہلا کر کہنے لگی، اوں ہوں' یہ کوئی اچھی چیز نہیں، ایک گھوڑا اس سے ہزار درجہ بہتر ہے مجھے اس سے ڈر لگتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ بُرے دن آرہے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ چشمے کے کنارے بیٹھ گئی. اس نے مٹی کی ٹھلیا کو چشمے میں پھینک دیا. اور اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے اُسے ننھے ہچکولے دینے لگی۔ جیسے کسی کھلونے سے کھیل رہی ہو۔ اس کی آنکھیں خوابیدہ سی ہو گئیں جیسے کوئی عجیب سا سپنا دیکھ رہی ہو. وہ کیا سوچ رہی تھی جنگل کی حسین شاعرہ ،

جب وہ اس طرح چشمے کے کنارے اپنے خیالوں میں مست ٹھلیا کو اپنی انگلیوں میں تھامے سوچ رہی تھی۔ تو یکایک سورج کی آخری کرنیں اس کے چہرے پر پڑیں، ان کندنی کرنوں کے جھلملاتے ہوئے ارغوانی ہالے نے اس کے چہرے کو اور بھی حسین اور پُراسرار بنا دیا۔ اور یکایک مجھے احساس ہوا کہ یہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ بلکہ خود جنگل کی دیوی تھی۔ جسے ایک حقیر انسان نے دنیائے تہذیب سے بہت دُور ایک نیلے چشمے کے قریب بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ ہاں وہ جنگل کی دیوی ہی تو تھی۔ خوب صورت، پُراسرار، وحشی، گمنام اور معصوم!

ٹھلیا دیر تک چشمے میں ناچتی اور گنگناتی رہی۔ اور آخر کار پانی سے بھر گئی پھر یکایک اس کی مالکہ بھی اپنی خوابوں کی دنیا سے اس غیر دلچسپ اور پھیکی دنیا میں لوٹ آئی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "آپ کا نام کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "نیرا۔" یہ کہہ کر اس نے نگاہیں نیچی کر لیں اور ایک ہلکی سی سرخی اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔

"اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟" میں نے اس سے کہا۔ آپ کا نام تو بہت اچھا ہے نیرا، نیرا یعنی آنسوؤں والی، گو میں آپ میں رونے کی کوئی بھی کیفیت نہیں دیکھتا۔

سوائے آپ کی آنکھوں میں جن کی ملائمت اور نرمی کسی ہرنی کی آنکھوں، کی یاد دلاتی ہے۔"

اس پر وہ اور بھی شرمائی، شاید اپنی تعریف سن کر خوش ہوگئی پھر وہ آہستہ سے کھڑی ہوگئی، اس نے ٹھلیا پانی سے نکال کر اپنے سر پر رکھ لی اور اپنے دونوں بازو اس کے نیچے باندھ لئے۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "کیا ہمیں رات بسر کرنے کیلئے کوئی جگہ مل سکتی ہے آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میرا شوفر بھی میرے ساتھ ہی ہے۔"

نیرا نے فوراً جواب دیا۔ "کیوں نہیں، بیشک میرے بابا آپ کو ضرور جگہ دیں گے، آئیے۔ گو ہم بہت غریب لوگ ہیں، لیکن یہاں اور کوئی رہتا بھی نہیں، میرے ساتھ آئیے۔"

دو دن کے بعد سحر کے دھندلکے میں، اسی سڑک کے کنارے میں اور نیرا ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔ ڈرائیور نے آخر کار، کار کو درست کر لیا تھا اور اب ہم الوداع کہنے کیلئے تیار کھڑے تھے میں نے نیرا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور نہایت حسرت سے اُسے الوداع کہی، نیرا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہاں وہ آنسوؤں والی تھی، نیرا، دو دن ہم دونوں نے اکٹھے گزارے وہ ایک پاک

صاف اور معصوم ہستی تھی، جیسے کہ صرف جنگل کے رہنے والے ہی ہو سکتے ہیں۔ دو دن، دو خوبصورت خوشیوں سے بھرے ہوئے دن میں نے نیرا اور اس کے والد جنگل کے بوڑھے شکاری کی سادہ اور حسین زندگی سے بہت کچھ سیکھا۔ دو دن، جو مسرت افروز لمحوں کی طرح جلد ہی ختم ہو گئے۔ ان دو دنوں میں نیرا نے مجھے اپنے چھوٹے سے باغیچے میں کھلے ہوئے پھول دکھائے، اپنی کیاریاں، گائیں اور دھان کے کھیت اور میں نے؟ ———— میں نے اُسے حسن و محبت کے افسانے سنائے اور سیاہ دلوں کی ابلہ فریبیاں بیان کیں۔ میں نے اُسے بہت سی باتوں کے متعلق خبردار کیا۔ کیونکہ وہ بہت ہی معصوم تھی۔ خطرناک حد تک معصوم، سب سے بڑھ کر میں نے اسے اس چیز کے متعلق خبردار کیا جسے لوگ تہذیب کے مقدس نام سے پکارتے ہیں۔ تہذیب جو اب جلد ہی اس سڑک کے ذریعے اس علاقے میں پھیلنے والی تھی وہ نہایت خاموشی سے میری باتوں کو سنتی، ایک آہ بھر کر میرا شکریہ ادا کرتی اور پھر چپ ہو جاتی۔ اور اب ہم ایک دوسرے سے جدا ہونے والے تھے۔

میں نے چوتھی بار اس سے کہا۔ "اچھا نیرا الوداع۔"

اس نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے میرے کوٹ کو پکڑ لیا: "مت

جاؤ، پردیسی کیا تم ضرور چلے جاؤ گے؟"

سچ مچ اس غریب لڑکی کو مجھ سے انس سا ہو گیا تھا۔ میں نے ایک خفیف مسکراہٹ کے ساتھ نرم لہجے میں کہا۔" میں تم سے ملنے کیلئے آؤں گا۔ نیرا، ضرور، ہاں اب مجھے اجازت دو۔ اپنی دلکش مسکراہٹ کیساتھ مجھے الوداع کہو، نیرا۔"

نیرا اپنے آنسوؤں کے درمیان مسکرائی۔ سحر کے اُڑتے ہوئے دھندلکے میں میں نے دیکھا کہ نیرا کی پلکوں پر آنسو پھول کی پتیوں پر شبنم کے موتیوں کیطرح چمک رہے ہیں۔ اس نے جلدی سے الوداع کہی اور پھر یک لخت منہ موڑ کر سامنے کی گھاٹی پر چڑھنے لگی۔ اوپر اور اوپر، وہ گھاٹی کے اوپر چڑھتی گئی۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

گھاٹی کی چوٹی پر سورج کی کرنوں نے اس کی پیشانی کو چُوما۔ اور اس کے گرد ایک حسین ہالہ بنا دیا۔ اب وہ گا رہی تھی ایک میٹھا پُرسوز پہاڑی گیت جس کے الفاظ میرے کانوں نے نہ سنے، لیکن جس جانگداز نغمہ میرے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ میں اِسے بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن اس گیت کی وہ لے، وہ اس کا لازوال حسن۔ تڑپ اور درد آج تک میرے کلیجے میں محفوظ ہے۔"

انجینئر چپ ہو گیا، کمرے میں کتنی دیر تک خاموشی طاری رہی۔

آگ مدھم ہو چکی تھی اور دیواروں پر لمبے لمبے سائے ناچ رہے تھے۔ بہت دیر کے بعد میں نے آرام کرسی سے سر اُٹھایا۔ اور انجینئر کی طرف مڑ کر پوچھا "کیا تم پھر کبھی نیرا سے ملے؟"

لیکن انجینئر سو گیا تھا۔ اس کا سگار اس کے ہاتھ کی انگلیوں سے نکل کر فرش پر جا گرا تھا۔ اور غالیچے پر جل کر راکھ ہو چکا تھا۔

...۞...

بچپن

رفیع کو نیلا سے بہت محبت تھی، یوں تو رفیع کو ہر چیز سے محبت تھی۔ خوش نما رنگا رنگ تیتریوں کو باغ میں اڑتے دیکھ کر اس کا دل یکایک بیتاب ہو جاتا۔ اور وہ ان کے پیچھے خوشی کی وحشیانہ چیخیں مارتا ہوا پھولوں کی کیاریوں کو روندتا ہوا بھاگا بھاگا پھرتا، اور جھٹ سے اپنے پھُندنے والی ٹوپی سر سے اتار کر لاجوردی رنگوں والی ایک تیتری کو اس میں قید کر لیتا۔ پھر آہستہ سے حیرت اور پیار بھری نگاہوں سے تیتری کی طرف دیکھتا۔ اسے اپنی چھوٹی چھوٹی نازک اُنگلیوں میں پکڑ کر اِدھر اُدھر گھوماتا۔ تیتری کے پَر پھڑپھڑاتے اور یکایک اس کا دل رحم کے جذبات سے اتنا بھر جاتا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگتے۔ اور وہ اُسے یک لخت چھوڑ دیتا۔ تیتری اُڑتی ہوئی دور سونف کے پودوں سے پرے

شفتالوؤں کے درختوں کی چوٹیوں سے گزر جاتی۔

رفیع حیرت بھری نگاہوں سے اڑتی ہوئی خوبصورت تیتری کیطرف دیکھتا۔ کتنی اچھی تیتری تھی۔ محبت اور افسوس، یکایک ایک اور تیتری، سبز اور پیلے پیلے پروں والی پہلی تیتری سے بھی زیادہ حسین اور درخشاں — سنگھدراج کے پھولوں کے اوپر اُڑتی ہوئی دکھائی دیتی۔ اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں سے لمبی لمبی چھلانگیں مارتا ہوا سنگھدراج کے تختوں کی طرف دوڑنے لگتا۔ اسے واقعی تیتریوں سے محبت تھی۔

اسے آڑوؤں سے بھی محبت تھی۔ اور سیبوں سے بھی، اور لال لال رنگ کے شربتی انگوروں سے بھی۔ جب درختوں پر سیب سونے کے گیندوں کیطرح چمکتے اور لمبی لمبی سبز بیلوں میں پہاڑی انگور یاقوت کی طرح دمکتے تو انھیں دیکھ کر رفیع کا دل کسی نامعلوم خوشی سے کانپنے لگتا۔ صرف دل ہی نہیں بلکہ ٹانگیں بھی۔ وہ چاہتا کہ وہ جلد جلد درخت کی اونچی شاخوں پر چڑھ جائے۔ اور ہر ایک آڑو کو اپنے "نکر" کی ننھی ننھی جیبوں میں بھر لے۔ ہر سیب کو، انگوروں کے ہر خوشے کو اپنے گالوں کے اندر یا شاید اپنے دل کے اندر چھپالے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دنیا کا کوئی اور فرد اس کے سیبوں، آڑوؤں، انگوروں اور ناشپاتیوں کی طرف نگاہ بھی اٹھائے۔ اُسے یقیناً ان

سے محبت تھی اور باغ کے مالی کو یہ اچھی طرح معلوم تھا۔

اور پھر اسے اپنی انّا سے محبت تھی۔ جب امّاں انّا کو کبھی جھڑک دیتیں اور انّا اداس سی صورت بنائے آنچل کے ایک کونے سے آنسو پونچھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ تو رفیع اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا، سہم سہم کر قدم اُٹھاتا ہوا چپکے سے انّا کے کمرے میں چلا جاتا۔ اور انّا کے سیاہ لہنگے کا کونا پکڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ اداس، معصوم اور پیار بھری نگاہوں سے اپنی انّا کی طرف دیکھتا۔ وہ انّا کو چپ کرانا چاہتا۔ وہ اُسے ڈھارس دینا چاہتا۔ لیکن خبر نہیں کیوں وہ کچھ نہ کر سکتا۔ پھر یکایک اس کا گلا بھر آتا اور انّا کو روتے دیکھ کر وہ بھی بے اختیار سسکیاں لینے لگتا۔ پھر انّا اسے اپنی گود میں لے لیتی۔ اُسے اپنے بازوؤں میں زور سے بھینچ کر چھاتی سے لگا لیتی۔ اپنے گیلے رخسار اس کے نرم نرم گالوں سے لگا دیتی اس کا منہ اتنی بار چومتی کہ اس کا دم رُکنے لگتا۔ پھر آہستہ آہستہ انّا کی سسکیاں بند ہو جاتیں۔ اور اس کے آنسو خشک ہو جاتے ——— ہاں اُسے اپنی انّا سے محبت تھی۔

لیکن انّا سے محبت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اُسے امّی اچھی نہیں لگتی تھی۔ امی تو اس کی جان تھی۔ لیکن وہ کیا کرے۔ امّاں

ہی اسے ہر وقت اپنے پاس نہ رہنے دیتی تھیں۔ جاؤ ننھے باغ میں کھیلو، جاؤ منّے سکول جاؤ۔ رفیع سیر کو جاؤ۔

وہ جب دیکھتا، امی کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتیں۔ امی کچن میں جائیں تو وہ پیچھے بھاگتا۔ اور کروشیا یا سلائیاں لے کر بیٹھتیں تو وہ صوفے کا کونا پکڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ اور امی کے بالوں سے کھیلنے لگ جاتا۔ اماں جھڑک دیتیں۔ "ننھے تم نے سبق نہیں یاد کیا۔" اور وہ سہم جاتا۔ "جاؤ کام کرو۔"

اور وہ دھیمے دھیمے قدموں سے واپس چلا جاتا۔ اُسے تو اماں سے محبت تھی۔ لیکن اماں ہی اُسے ہر وقت پیار نہیں کرتی تھیں۔ جب گھر میں مہمان عورتیں آتیں تو وہ مچل جاتا اور بار بار اماں کے پاس جا کھڑا ہوتا۔ لیکن اماں اسے یونہی چمکار کر کہہ دیتیں "رفیع بیٹا باہر کھیلو۔"

ہاں کبھی کبھی وہ اماں کی گھُرکیوں کی بھی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اماں طشتری اُٹھائے ہوئے ابا کیلئے کھانے کے کمرے میں تراشے ہوئے پھل لے جا رہی ہوتیں کہ وہ ان کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا۔ شریر ننھے، شریر رفیع کہنے سے کیا ہوتا تھا۔ وہ اُردو کی تیسری کتاب اُٹھائے ہوئے اماں کے ارد گرد شور مچاتا

ہوا بھاگتا اور انھیں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے دیتا۔ تھک کر اور ہار کر وہ اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتیں۔ اماں کی میٹھی اور مہربان نگاہیں دیکھ کر وہ ان کی گردن سے لپٹ جاتا۔ "میری اچھی امّی۔"

وہ اباجی کو بھی بہت چاہتا تھا اگرچہ اسے پتہ تھا کہ ابا بہت بڑے آدمی ہیں۔ اور نرم لہجے میں بہت کم بات کرتے ہیں۔ پھر بھی وہ انھیں بہت چاہتا تھا۔ اگر وہ دورے پر جاتے تو وہ ہمیشہ ضد کرتا۔ "مجھے بھی ساتھ لے چلو ابا، لے چلو نا ابا۔ اچھے اباجی، اباجی۔"

لیکن ان منتوں سماجتوں کا اباجی پر ہمیشہ کم اثر ہوتا تھا۔ اور تو اور وہ شام کو سیر کرنے کے وقت بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ چلے جایا کرتے۔ اور بیچارا رفیع چیختا ہی رہتا۔ ابا دورے سے واپس آتے تو وہ کتنی دیر پہلے ہی ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر ابا کی راہ دیکھتا رہتا۔ اور جب ابا دور سے ہی گھوڑے پر سوار ندی کے قریب کی پگڈنڈی پر نظر آجاتے۔ تو وہ فرطِ مسرّت سے چلّا اُٹھتا۔ اباجی آگئے، وہ آگئے، وہ آگئے، ہاں وہ اباجی کو بہت چاہتا تھا۔

لیکن محبت تو اُسے نیلا سے ہی تھی۔ نیلا بیگم

فتح دین چپراسی کی لڑکی تھی ۔ عمر میں شاید رفیع سے ایک برس بڑی ہی تھی شاید اسی وجہ سے وہ بیچارے رفیع کی پرواہ تک نہ کرتی تھی ممکن ہے کہ کوئی اور وجہ بھی ہو ۔ لیکن اس کا رفیع کو پتہ نہ تھا ۔

بہرحال رفیع کو جتنی نیلا سے محبت تھی ۔ اتنی ہی نیلا اس سے بیگانہ تھی ۔ اس نے تو آج تک کبھی رفیع سے بات بھی نہ کی تھی ۔ بلکہ جب کبھی وہ رفیع کے پاس سے گزرتی (اور رفیع کو ایسے موقعے بہت کم ملے ہوں گے) ، تو سر اٹھا کر اپنے خوبصورت گھونگھر والے بالوں کو جھٹکا کر اس کے پاس سے گزر جاتی ۔ غریب رفیع کو اس وقت بہت ہی ذہنی تکلیف ہوتی تھی ۔ وہ اس چھوٹے سے قصبہ کے ہر ننھے گڈریے سے ہنس ہنس کر بات کرتی تھی ۔ مگر بچارے رفیع کو ہی یہ مسرت حاصل نہ ہوئی تھی ۔

یوں تو یہ کوئی بہت بڑی بات نہ تھی ۔ رفیع کی معصوم زندگی میں چند ایک ہی ایسے تکلیف دہ لمحے آئے تھے ۔ ورنہ دن بھر تو وہ نیلا کو کم و بیش یاد بھی نہ رکھتا تھا ۔ سکول کی قید ، ماسٹر کی گھرکیاں حساب کے سوال جمع تفریق ضرب تقسیم ، باغ میں اچھل کود ، رات کو وہ جب تھک کر بستر پر لیٹتا تو بس پھر صبح امی ہی اسے مشکل سے جگاتی تھیں ۔

لیکن جب نیلا سامنے آجاتی یا جب وہ باغ میں پھولوں سے اکیلا کھیلتا کھیلتا اکتا جاتا۔ تو نیلا کی حسین گڑیا جیسی صورت کا خیال کر کے وہ ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا۔ اور اس کا جی چاہتا کہ وہ خود نیلا کو بلا لے، بھلا وہ اسے کیا کہے گی۔ اچھا تو، بھلا وہ اس سے ہی کیوں نہیں بولتی۔

ایک دن جب وہ یوں ہی کھیلتا کھیلتا ندی کے کنارے چلا گیا تھا۔ جہاں ندی پہاڑ کے قدموں سے ٹکرا کر اپنا بہاؤ تبدیل کرتی ہوئی جنوب کیطرف مڑ جاتی تھی۔ تو وہاں اس نے ایک تنگ کے بہت بڑے درخت کے نیچے بہت سے اپنے ہم جولی دیکھے۔ کئی پتنگیں بڑھا رہے تھے۔ کئی بانسریاں بجا رہے تھے۔ کئی بچھڑی ہوئی بھیڑ بکریوں کو آوازیں دے دے کر واپس بلا رہے تھے۔ دو تین ندی کے کنارے نہا رہے تھے۔ اور ندی کے نیلے پانی میں تیرنے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے۔ ایک طرف منوہر صادق حسنی، نوراں کیھتری اور بہت سے لڑکے لڑکیاں ریت کے ٹیلے کھود کھود کر عالیشان محل بنا رہے تھے رفیع بھی ان کے ساتھ جا کر کھیلنے لگا۔ ان میں نیلا بھی تھی۔ وہ بہت دیر تک ان کے ساتھ کھیلتا رہا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں

نہ اس نے نیلا سے بات کی۔ نہ نیلا نے اس سے، کھیلتے کھیلتے نیلا اور کیتھری جھولے کے قریب چلی گئیں۔ اور پتنگ بڑھانے لگیں۔ رفیع حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے آج تک کبھی پتنگ نہ بڑھائی تھی۔ اتنی اونچی اُسے تو جھولے پر بیٹھنے سے بھی ڈر لگتا تھا۔

صادق بانسری بجا رہا تھا۔ رُک کر بولا۔ "پتنگ بڑھاؤ گے"۔ رفیع انکار نہ کر سکا۔ خاص کر نیلا کے سامنے جو دوسرے جھولے سے اتر کر اب پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

رفیع ڈرتے ڈرتے جھولے پر چڑھا۔ لیکن اب اُسے پتنگ بڑھانے کا ڈھب نہ آتا تھا۔ ناچار کہنے لگا۔ "مجھے جھولا دو۔" یہ سن کر بہت لڑکے لڑکیاں ہنس پڑے۔ رفیع کو ایسا معلوم ہوا کہ نیلا کی ہنسی ان سب میں سے بلند تھی۔ وہ شرمندہ سا ہو گیا اور جھولے سے اُتر کر سیدھا گھر کی طرف چلا گیا۔ وہ غمگین اور اداس جا رہا تھا۔ اسے کسی پر غصہ نہ تھا۔ صرف اُسے بار بار نیلا پر غصہ آ رہا تھا گھر پہنچتے پہنچتے اس کی سسکیاں تیز ہوتی گئیں۔ اور جب وہ بڑے پھاٹک کے اندر داخل ہوا تو وہ زار و قطار رو رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" امّاں نے پوچھا۔

"کیوں رو رہے ہو بیٹا؟"

"بیٹا رفیع کیا بات ہے ؟"

"میرے رفیع کو کس نے مارا ہے ؟"

"ننھے تم اتنی دیر کہاں کھیلتے رہے یہاں بے چارا مالی ڈیڑھ دو گھنٹے سے تمھاری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ بولو رفیع ننھے ؟"

لیکن ننھا رفیع دیر تک روتا رہا۔ آخر جب وہ چپ ہوا تو سسکیوں کے درمیان میں رُک رُک کر بولا۔

"میں .... میں ...... ایک جھولا .... ایک جھولا لگوا دو امی ۔"

نیلو رفیع کے ہاں کئی بار آئی۔ کبھی امی سے مٹھائی لینے کیلئے، کبھی کوئی کپڑوں کا جوڑا لینے کیلئے، کبھی پکے ہوئے اخروٹ دینے کیلئے جو اس کے گھر کے آنگن میں اُگے ہوئے درخت پر لگتے تھے۔ لیکن رفیع اُسے دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کئی بار رات کو سوتے وقت جب انّا اُسے پریوں کی کہانیاں سناتی تو وہ سوچا کرتا کہ کیا پریاں نیلا کی طرح خوبصورت اور مغرور ہوا کرتی

ہیں. لیکن یہ بات اماّں سے پوچھنے کا اِسے کبھی حوصلہ نہ ہوا. نیلا اسے ایک مورت کیطرح پیاری لگتی تھی. کبھی وہ سوچتا اس کے گال کتنے لال لال ہیں. اور اس کے ہونٹ اس کے اپنے گالوں یا ہونٹوں کا رنگ تو اتنا صاف نہ تھا. اچھا تو اگر وہ بھی نیلا کی طرح خوبصورت بن جائے. تو کیا پھر بھی نیلا اس سے نہ بولے گی. یہ خیال اسے اس وقت آیا جب کہ وہ سنبلو کی ایک اونچی جھاڑی کے قریب کھڑا ہوا پکے ہوئے سرخ سرخ سنبلو توڑ توڑ کر کھا رہا تھا. ان سنبلوؤں کا رنگ کتنا سرخ تھا. سنبلو کھاتے کھاتے اس نے چار پانچ سنبلو توڑ کر اپنے گالوں پر مل لئے. اور اپنے ہونٹوں اور ٹھوڑی کو بالکل لال کر لیا. پھر یکایک اُسے دوسری جھاڑی کے قریب ایک خوبصورت تیتری دکھائی دی. اور وہ نیلا کے متعلق سب کچھ بھول گیا. وہ کتنی دیر تک تیتریاں پکڑنے میں مصروف رہا. آج اس نے سات خوب صورت تیتریاں پکڑیں. اور انھیں پھر اس نے اپنے چھوٹے سے رومال میں جمع کر لیا. اور انھیں گھر لے گیا.

اماّں نے پوچھا. "یہ منہ کیوں لال کر رکھا ہے. شاید آج پھر سنبلو کھاتے رہے ہو. میں نے تمھیں کئی بار سمجھایا ہے. کہ سنبلو نہ کھایا کرو. لیکن تم مانتے ہی نہیں. کیوں ؟ ان بچاری تیتریوں

نے تمہارا کیا بگاڑا ہے ؟"

جب رفیع کے ایک دو طمانچے لگے تو وہ زور زور سے روने لگا۔

۵

عید کے دن فتح دین کی لڑکی حسبِ معمول ایک رومال میں خوبانیاں باندھ کر رفیع کے گھر دینے آئی۔ رفیع گھر پر موجود نہ تھا۔ وہ باغ میں باڑ کے قریب چنبیلی کے پھولوں کے پودوں سے پھول توڑ رہا تھا۔ اور ہار بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیلا جب خوبانیاں دے کر باغ کے قریب سے گزری تو رفیع کو باڑ کے قریب بیٹھے دیکھ کر رُک گئی۔ وہ مزے سے ہار بنانے میں مشغول تھا۔

رفیع بچارے کو پتہ ہی نہ تھا کہ نیلا پاس ہی کھڑی ہے یکایک نیلا نے باڑ سے ایک ٹہنی توڑی۔ رفیع نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ نیلا تھی۔ اس کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔ اس نے ہار بنانا چھوڑ دیا اور اُٹھ کر باڑ کے قریب کھڑا ہو گیا۔

نیلا بولی۔ "تمہارا نام رفیع ہے ؟"

"ہاں، رفیع۔"

"ریچی !"

"ریچی کیا نام ہے ؟" نیلا نے اپنی چھوٹی سی ناک کو اونچا کر کے کہا۔

"ریچی نہیں، رفیع !"

نیلا بولی۔ "میرا نام نیلا ہے۔ ہم وہاں رہتے ہیں (انگلی سے اشارہ کر کے) وہ ان اخروٹ کے درختوں کے پیچھے۔"

رفیع کہنے لگا۔ "ہمارے ہاں چنبیلی کے پھول بہت اچھے ہیں —"

نیلا بولی: "ہمارے ہاں خوبانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔"

رفیع کہنے لگا۔ "ہمارے باغ میں بھی بہت اچھی — خوبانیاں ہیں۔"

نیلا نے سر ہلا کر کہا۔ "جھوٹ، ہماری خوبانیاں سب سے میٹھی ہوتی ہیں۔"

رفیع کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "میں پتنگ بڑھا سکتا ہوں۔ بہت اونچی لے جا سکتا ہوں۔"

"اچھا ؟" نیلا نے ایسے کہا جیسے اس کی بات پر یقین نہ آ رہا ہو۔

"میں اپنے باغ کے ہر درخت پر چڑھ سکتا ہوں۔"

"ہوں۔؟"

"میں —— میں چنبیلی کے ہار بنا رہا ہوں۔ یہ دیکھو!"

نیلا بولی — "ہم تم سے اچھے ہار بنا سکتے ہیں۔ اِدھر دکھاؤ پھول!"

رفیع نے نیلا کا ہاتھ پکڑا اور اسے باڑ کے اس طرف لے آیا۔ پھر دونوں بیٹھ کر ہار بنانے لگے۔ ہار بناتے بناتے نیلا ہنسنے لگی۔

رفیع نے حیران ہو کر پوچھا "کیوں ہنستی ہو؟ کیا بات ہے؟"

نیلا ہنستے ہوئے کہنے لگی .... "میں کہتی ہوں تم ہار نہیں بنا سکتے اور کیا؟"

رفیع کو جو غصہ آیا تو اس نے نیلا کے ایک طمانچہ لگا دیا۔ نیلا کہاں ہنس رہی تھی۔ کہاں اب زور زور سے رونے لگی۔ نیلا کو روتے دیکھ کر رفیع بہت پریشان ہوا۔ کیا کرے؟ کیا نہ کرے۔ اگر امی کو پتہ لگ گیا کہ اس نے نیلا کے طمانچہ لگایا ہے تو پٹ جائے گا۔ چنانچہ وہ نیلا کی منتیں کرنے لگا۔

"اچھا نیلا جانے دو۔ مت رؤو۔ میں کہتا ہوں مت رؤو۔

دیکھو میرے پاس تیتریوں کے تین سو پر ہیں۔ وہ اندر ڈبے میں بند رکھے ہیں۔ میں وہ سب تمھیں دے دونگا۔ لو اب تم نہ روؤ۔ میں تمھیں ابھی لا کر دیتا ہوں۔"

رفیع دوڑتا دوڑتا گھر گیا۔ اور تیتری کے پروں والا ڈبہ لے آیا۔ اور ڈبہ کھول کر نیلا کے سامنے رکھ دیا۔ کتنے اچھے پر ہیں۔ یہ دیکھو، دیکھونا۔ نیلا مت روؤ۔ اور یہ سب پھول اور ہار بھی تمھارے ہوئے رفیع نے ایک دو ہار اُٹھا کر نیلا کے گلے میں پہنا دیئے۔

نیلا روتے روتے ہنسنے لگی۔

اس دن سے نیلا اور رفیع اکٹھے کھیلتے رہے۔ انھوں نے جھاڑیوں سے سنبلو چن چن کر کھائے۔ انگور کی بیلوں پر چڑھ کر سونے کی طرح چمکنے والے انگوروں کے خوشے توڑے۔

نیلا کے گھر میں اخروٹ کے درخت کے سائے تلے بیٹھ کر "قاضی کو لڑا" اور بچپن کے دوسرے مجبوب و مرغوب کھیل کھیلے۔ وہ ندی کے کنارے جا کر گڈریوں کے ساتھ ناچے ..... پینگیں بڑھائیں۔ بانسریوں کے گیت سُنے۔ کبھی کبھی رفیع دولھا بنتا تھا۔ اور نیلا دُلھن اور گھاٹی کے دامن میں ننھے ننھے گڈریئے براتی بنے ہوئے شور مچاتے ہوئے کاغذ کی ڈفلیاں بجاتے ہوئے بھاگتے پھرتے تھے۔

ایک عجیب نظارہ ہوتا تھا۔ اور جب کبھی نیلا کھیل ہی کھیل میں شوخی یا شرارت سے کسی دوسرے گڈریئے کی دلھن بن جانے پر آمادگی ظاہر کرتی تو رفیع بگڑ کھڑا ہوتا اور کھیل میں حصّہ لینے سے انکار کر دیتا اور لڑائی پر تل جاتا یا نیلا سے روٹھ جاتا۔ روٹھے ہوئے کو منانے کے لئے نیلا کو کیسی کیسی منتیں کرنی پڑتی تھیں اور بہت سخت قسمیں کھانی پڑتی تھیں۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔ اس خوبصورت وادی میں دو ننھے دلوں نے پاک اور معصوم محبت کا ایک میٹھا، سہاؤنا اور پیارا سپنا دیکھا۔ وہ سپنا جو پہاڑی جھرنوں کے گیتوں کی طرح دلفریب تھا۔ وہ محبت جو ستاروں کی طرح روشن اور بلند تھی۔ پھر یکایک رفیع کے والد کی تبدیلی کسی اور جگہ ہو گئی۔ اور رفیع اور نیلا نے دھڑکتے ہوئے دلوں اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو الوداع کہی۔

رفیع نے جاتے وقت وہ چیز بھی نیلا کو دے دی۔ جسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ یہ ایک چاقو تھا۔ جس کا پھل بہت تیز اور چمکدار تھا۔ اور دستے پر رنگ برنگ کے سیپ لگے ہوئے تھے۔

اور نیلا . . . ؟ نیلا نے بھی اپنی سبز منکوں کی مالا جسے

وہ ہر وقت اپنے گلے میں پہنے رکھتی تھی اتار کر رفیع کو دیدی۔ اور یہ سب کچھ چھپ چھپ کر ہوا۔ لیکن ٹھیک اس وقت کہ جب رفیع کے گھر کے لوگ روانہ ہونے کو تھے۔ اور رفیع کو ایک گھوڑے پر سوار کیا جا رہا تھا۔ نیلا سسکیاں لیتی ہوئی رو پڑی۔ رفیع کا دل بیتاب ہو گیا۔ لیکن اس وقت اس نے نہایت ہمت سے کام لیا۔ اس نے اپنے آنسو روک لئے۔ اور منہ پھیر کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سفید سفید بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔

تیرہ سال اور گزر گئے۔ اور پھر ایک بار رفیع کے والد کی تبدیلی اسی حسین وادی میں ہوئی جہاں نیلا رہتی تھی۔ رفیع کے دل میں بچپن کے خواب جاگ اُٹھے۔ اور اس عہد کی معصوم خوشیاں اور اس زرّیں زمانے کی تمنائیں دل میں کروٹیں لینے لگیں۔ کیا وہ نیلا کو بھول گیا تھا۔؟ کیا کالج کی ہنگامی زندگی نے اس کے دل پر بچپن کا کوئی بھی نقش باقی نہ رہنے دیا تھا؟ کیا اب بھی وہ نیلا کو اسی طرح چاہتا تھا۔ ان سب باتوں کا جواب شاید رفیع بھی اچھی طرح

سے نہ دے سکتا تھا۔ ہاں شاید وہ نیلا کو قریبًا بھول ہی گیا تھا۔ لیکن بالکل نہیں، وہ سبز منکوں کی مالا ابھی تک اس کے پاس تھی۔ اور کسی قیمت پر بھی وہ اسے اپنے آپ سے جُدا نہ کر سکتا تھا۔

کالج کے پُر مسرت لمحوں میں بھی اس نے اکثر نیلا کو یاد کیا۔ لیکن یوں ہی کبھی وہ اپنے بچپن کے دلکش کھیلوں کو یاد کر کے مسکرا دیتا۔ عجب زمانہ تھا۔ نہ ہاکی، نہ فٹ بال نہ ٹینس، پھر بھی کتنی مسرت تھی، ان کھیلوں میں۔ اور نیلا وہ ننھی سی شوخ گڑیا تتلا کر باتیں کرتی ہوئی۔ ایک عجیب دلکش ادا سے ہنستی ہوئی۔

لیکن اب جب گرمیوں کی چھٹیوں میں اس نے گھر آکر نیلا کو دیکھا۔ تو حیران رہ گیا۔ آخری بار جب اس نے نیلا کو دیکھا تھا۔ تو وہ ایک ننھی سی پری تھی۔ جو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر روتی جاتی تھی اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ پھر تیرہ سال تک اس کے تخیّل میں نیلا کی یہی تصویر رہی۔ وہ خود لڑکپن سے شباب میں آگیا۔ اس کے والد کے سر کے بال سفید ہو گئے باغ میں ناشپاتیوں کے وہ درخت جو آج سے تیرہ سال پہلے نہایت پتلے اور چھوٹے تنوں کے پودے تھے۔ آج اپنی شاخیں آسمان کی طرف بلند کئے کھڑے تھے اور نیلا ...... وہ ننھی سی گڑیا؟

لیکن جلد ہی وہ نیلا کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ باغ میں ایک سیب کے درخت کے نیچے کتاب کھولے بیٹھا تھا۔ کہ کوئی اس کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ ہاں یہ نیلا ہی تھی۔ سرو کی طرح بلند قامت، شباب کی رعنائیوں کا مرقعِ جمیل، اس کے لبوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ تھی۔ جو شاید سورج کی کرنوں سے مل کر بنی تھی۔ اس کی گود میں ایک ہنستا ہوا بچّہ تھا۔

رفیع اُٹھ کھڑا ہوا۔

نیلا بولی۔ "تم نے مجھے پہچانا بھیّا؟"

رفیع کے منہ سے نکلا۔ "نیلا!"

نیلا ہنسنے لگی۔ وہی دلکش ہنسی، بچّہ رفیع کو دیکھ کر کلکاریاں مارنے اور زور زور سے بازو ہلانے لگا۔

رفیع نے آگے بڑھ کر اور بچّے کے شانوں کو چھو کر کہا۔

"یہ تمہارا لڑکا ہے نا۔ کتنا خوبصورت ہے اس کا کیا نام ہے؟"

نیلا نے کانپتی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا۔ "ہاں، اِس کا نام ہے رپھی، محمد رپھی۔"



کتنی ہی دیر رفیع خاموش کھڑا رہا۔ نہ اس کے پاؤں تلے

زمین تھی اور نہ سر پر آسمان، وہ خلا، میں گھوم رہا تھا۔ نہایت تیزی سے گھوم رہا تھا۔ پھر یکایک ایک جھٹکے کے ساتھ وہ بچپن کی زندگی میں لوٹ آیا۔ وہ چھوٹا سا تھا، ننھا رفیع، اور نیلا کے ساتھ بھاگ بھاگ کر تیتریاں پکڑ رہا تھا۔ نیلا اور وہ سنبلو کی شاخوں پر جھکے سنبلو کھا رہے تھے۔ ندی کے کنارے اونچے تنگ پر جھولا جھول رہے تھے۔ گڈریئے بانسریاں بجا رہے تھے۔ گڈریئے براتی بنے ہوئے تھے۔ اور نیلا اس کی دلھن۔

بچے نے رفیع کے چہرے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "با.... با.... با، با...."

رفیع بچے کی طرف جھکا پھر اس نے آہستہ سے اپنی جیب کے اندر سے کوئی چیز نکالی، یہ سبز موتیوں کی ایک مالا تھی۔ آہستہ سے اس نے یہ مالا بچے کے گلے میں ڈال دی۔

نیلا کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے لیکن رفیع نے نہایت ہمت سے کام لیکر اپنے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روک لیا اور نگاہیں اُٹھا کر گھاٹی سے اوپر آسمان کیطرف دیکھنے لگا۔ جہاں سفید سفید چمکتے ہوئے بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔

.....٭.٭.....

گلفروش

جب گل فروش کا بیٹا "میٹرک" پاس کر چکا تو بوڑھے باپ نے
بیٹے کے ہاتھ میں ایک سائیکل دے کر یوں کہا۔

"جا بیٹا نوکری تلاش کر!"

بالکل اسی طرح جیسے قرونِ وسطیٰ کا ناول نویس اپنے
قصّے کے ہیرو کو اپنی محبوبہ کی تلاش میں کسی بے آب و گیاہ خطۂ صحرائی
میں چھوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔ بیچارے لڑکے کے
سائیکل چلاتے چلاتے ٹخنے زخمی ہو گئے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔
وہ معصوم پھول سا چہرہ کمہلا گیا۔ مگر نوکری کہیں نہ ملی۔ گوہرِ مقصود نہ
ہاتھ آیا پر نہ آیا۔

آخر ہار مان کر اور سائیکل کا ہینڈل توڑ کر گل فروش کے

بیٹے نے اپنے بوڑھے باپ سے کہا۔ "ابا نوکری ملنا کچھ آسان نہیں۔ یہاں تو اس کے لئے بڑے بڑے مارے مارے پھرتے ہیں۔ میں غریب کیا کروں ؟"

بوڑھے باپ نے چلم پر سے راکھ جھاڑی اور رک رک کر بولا۔ "کرنا..... کیا...... ہے ؟ دکان پر بیٹھ جا.... گل فروش کا بیٹا بھی گل فروش ہے .... پھول بیچ اور گزارہ کر..... مولوی ٹھیک کہتا تھا۔ اس لونڈے کو انگریزی کیوں پڑھاتے ہو ؟ لمبے بال رکھے گا اور عورتوں کیطرح مانگ نکالے گا۔ کل سے یہ زلفیں کٹا دے اور ہار بنا........ سنا تو نے ؟"

اتنا کہنے کے پانچ سال بعد بوڑھا گل فروش راہیٔ عدم ہوا۔

بوڑھے باپ کے مرنے پر گلفروش نے اپنی دکان انارکلی کے سرے پر کر لی۔ انگریزی تعلیم نے اسے جدت پسند بنا دیا تھا۔ اس نے ہار اور گجروں کے نئے نئے نمونے ایجاد کئے اور مشہور و معروف فلم ایکٹرسوں پر ان کے نام رکھے، گوہر آبدار، کجن ادا۔

گل گاربو۔ سلوچنا ہار وغیرہ، اور بھی کتنے ہی دلربا اور دلکش نمونے تھے۔ جو تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول ہوئے۔ اس کی دکان بہت چمک اٹھی۔ اب اس نے ہاتھ بٹانے کیلئے دو تین ملازم بھی رکھ لئے۔ ریڈیو بھی لگا دیا۔ اخباروں میں اشتہار بھی دینے لگا۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

نرگس کا سیزن آگیا ہے

ہماری دکان پر تشریف لاکر نرگسی ہاروں کے "اپ ٹو ڈیٹ" ڈیزائن ملاحظہ فرمایئے۔

گریٹا گاربو کی نئی پکچر کی تقریب پر گل گاربو کے گجرے پہنئے اور پہنایئے۔

پھولوں کے خوشنما آویزے آپ کے حسن کے بہترین محافظ ہیں!

پردے کا خاص انتظام ہے۔

گلفروش کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ نہایت خوشگوار نکلا، ہار

گجرے وغیرہ پہننے کا پرانا دستور ہندوستانی سوسائٹی میں از سرِ نو زندہ ہو گیا، پہلے تو تہواروں پر بھی لوگ ہار کم پہنتے تھے مگر اب کلرک، بابو، منشی لوگ، دفتر بھی پھول لے کر جانے لگے۔ چنانچہ سیاہی سے گندی میزیں اور قلمدان پھولوں سے سج گئے۔ دفتر گلستان بن گئے۔ ہر طرف اِک مہک سی اُڑی پھرتی تھی۔ کالج کے طلبہ تو ہاروں کے اس قدر شیدائی ہوئے کہ پھولوں کے ہار بھی اپنی ٹائی یا سوٹ کے رنگ کی مناسبت سے چُننے لگے

عورتوں اور پھولوں کا میل تو یوں بھی آنکھوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اب تو انتہا ہی ہو گئی۔ اگر ایک خاتون سراپا "نرگس" بنی ہوئی جا رہی ہے تو دوسری "موتیا" کی ڈالی، ایک زعفران زار تھی تو دوسری دھان کا کھیت، جس کی بھینی بھینی خوشبو اور خوشنما ہریاول آنکھوں کو طراوت بخشتی تھی۔

ہونے کو تو یہ سب کچھ ہوا لیکن ہندوستان کی اِن قدیم روایات کو تازہ کرنیوالے کا دل ہمیشہ غمگین و محزون ہی رہا نوجوان گل فروش ہمیشہ یہی سوچا کرتا کہ اگر وہ پھول نہ بیچتا تو اس وقت تک کم از کم بی۔اے پاس کر لیتا۔ اور پھر اس کو "نوکری" کہیں مل ہی جاتی ——— اور پھر اس کی شادی

بھی کسی تعلیم یافتہ حسین لڑکی سے ہو جاتی۔ اور یہ بالکل اغلب تھا۔ لیکن...... اب...... اب وہ لمبے سانس بھرتے ہوئے سوچتا اب اس کی زندگی اس پھولوں کی دکان پر ریڈلوسن کر اور گجرے بیچ کر برباد ہو گئی تھی۔ اب وہ محض ایک ویران، شکستہ، کھنڈراتی زندگی کا مالک رہ گیا تھا۔ آثارِ قدیمہ کے محکمہ کیطرح، تعلیم یافتہ لڑکی تو اس کے طبقے میں دو ہزار تنبوں والا اعلیٰ کا قمقمہ لے کر ڈھونڈنے پر بھی دستیاب نہ ہو سکتی تھی۔ اور جو لوگ اپنی لڑکیاں سکولوں اور کالجوں میں پڑھاتے تھے غالباً ان کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ ان کی لڑکی کسی پھول بیچنے والے کے پلے باندھ دی جائے۔ وہ سماج کا اچھوت تھا۔ ہریجن ہری جن...... اب ان اونچے طبقے والے لوگوں نے ایک نیا لفظ اسی پرانے خیال کو ادا کرنے کیلئے اختراع کیا ہے۔ کچھ بھی ہو وہ اپنی زندگی ایک اُجڈ اور پھوہڑ بیوی کیساتھ نہیں بسر کر سکتا تھا۔ جسے نہ تو باڈیس پہننے کا سلیقہ ہے نہ ساڑھی لگانے کا قرینہ اور نہ ہی اخبار پڑھنے کی عادت، جو تمام دن اپنا سر چولھے میں دیئے رکھتی ہو۔ اونہہ...... وہ کسی عورت سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔ ایک باورچن سے نہیں! لیکن اس کے باوجود وہ دیگر امور میں ایک سادہ مزاج جوان سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً وہ اپنی

بوڑھی ماں کی بہت عزت کیا کرتا تھا۔ اور گو یہ بہت حیرت کی بات ہے پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اُسے اپنے بھائی سے بہت محبت تھی۔ اور گو وہ ریشم کی خوبصورت قمیصیں پہنتا تھا۔ جن پر لمبی لمبی خوش رنگ دھاریاں ہوتیں۔ اور عطر پھلیل لگاتا تھا۔ پھر بھی اُسے شراب، سگرٹ اور رنڈیوں سے بہت نفرت تھی۔ سینما، تھئیٹر دیکھنے پر بھی اس کے چال چلن میں کچھ فرق نہ آیا تھا۔ اس کے دوست اکثر اس پر تعجب کا اظہار کیا کرتے۔ آخر ایک پھول بیچنے والا کیونکر شریف رہ سکتا ہے؟

اس کی بوڑھی ماں کو بھی یہی شک تھا۔ یوں تو وہ اُس پر جان چھڑکتی تھی۔ مگر ڈرتی تھی کہ کہیں اس کا "انٹرنس پاس بیٹا" آوارہ نہ ہو جائے۔ جو نوجوان پھول بیچتا ہو اور سینما دیکھتا ہو اُس کیلئے شریف رہنا بہت مشکل ہے، آخر کب تک؟

اِسی لئے بوڑھی ماں اس کی شادی پر مُصر تھی۔ مگر نوجوان گلفروش نہیں مانتا تھا۔ اس کے ناتجربہ کار شاعرانہ دل نے پڑھی لکھی لڑکی کی ایک خیالی حسین مورت بنا رکھی تھی۔ وہ اسی کو پوجتا تھا اور اسی سے شادی کا خواہاں تھا۔

بس یہی جھگڑا تھا، ماں ایک میٹھی نرم مزاج، دیہاتی

بہو کے حق میں تھیں۔ اور ان کی نگاہ اپنے ہی قبیلے میں ایک قبول صورت غریب طبیعت لڑکی پر تھی۔ گلفروش اس کے برعکس ایک ساڑھی نواز سینما پسند، تیتری کی تلاش میں تھا۔۔۔۔۔۔۔ مگر آہ، یہ وہ تیتریاں تھیں جو اس کے گلوں پر کبھی بیٹھنا پسند نہ کرتیں۔ کیا وہ سوسائٹی کا اچھوت نہ تھا۔۔۔۔۔ محض ایک گلفروش۔

ایک سنیچروار کی دلکش شام کا ذکر ہے۔ اس دن نشاط تھیٹر میں وکٹر ہیوگو کا لافانی شاہکار "لے مسزرابلز" دکھایا جانا تھا۔ اور گلفروش دکان کو جلد بند کرنے اور وہاں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک چھوٹی سی "پارس" گلفروش کی دکان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس میں ایک جوان لڑکی اور ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھیں۔ گلفروش دکان کی سیڑھیاں اتر کر موٹر کے قریب گیا۔ اور بوڑھی عورت کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "میم صاحبہ کیا حکم ہے؟" اس پر جوان لڑکی نے موٹر کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "ہمیں کچھ ہار اور گجرے چاہئیں۔"

"آیئے، دکان کے اندر تشریف لائیے۔"

لڑکی نے بہت سے ہار خریدے، بہت سے گجرے، چند ایک گلدستے، چلتے وقت کہنے لگی، "کل ہمارے ہاں ایک ڈانس ہے بال روم کو سجانا ہوگا۔ کل اپنے آدمیوں کو ساتھ لے آؤ۔ کوئی چار بجے شام کو اور دو گھنٹوں میں کام ختم کردو، ٹھیک ہے؟"

گلفروش نے جواب میں سر جھکا دیا۔

جب وہ موٹر میں بیٹھ چکی تو نوجوان گلفروش نے پھر جھک کر سلام کیا اور انگریزی میں نوجوان لڑکی سے پوچھا۔

"سرکار آپ کا پتہ؟"

لڑکی کی آنکھوں میں حیرت کی ایک خفیف سی جھلک، اس کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے گردن کو ایک طرف جھٹکا کر کہا۔ "۱۰، فلیش روڈ، پلیز!"

نوجوان گلفروش نے چلتی ہوئی موٹر کو جھک کر ایک فرشی سلام کیا اور آہستہ سے کہا۔ "۱۰۔ فلیش روڈ، پلیز۔"

اس واقعے کے تین چار روز بعد گلفروش کی بوڑھی ماں

کو محسوس ہوا کہ اس کا بیٹا غیر معمولی طور پر اداس ہے۔ وہ نہ صرف کھانا کم کھانے لگا تھا بلکہ اب وہ اکثر کھانا کھاتے ہوئے منٹوں ایک طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا تھا۔ ایک نوالہ منہ میں، دوسرا ہاتھ میں لئے وہ کچھ سوچنے لگتا۔ پھر کچھ یاد آجانے پر ایک آہ سرد بھر کر جلد جلد نوالے اٹھانے شروع کر دیتا۔ کبھی وہ چمپا کی چاندنی جیسی حسین اور نازک کلیوں کو زریں تاروں میں پروتے ہوئے یکایک رُک جاتا، مسکراتا، پھر فوراً غمگین ہو جاتا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگتے۔ اور جب اس کی ماں اس سے دریافت کرتی، کیا بات ہے بیٹا؟، تو وہ اس درد بھرے سوال کے جواب میں ایک کھسیانی ہنسی ہنس دیتا اور کہتا۔ "کچھ بھی نہیں امّاں!"

اور امّاں دل میں سوچتیں، ضرور کسی لڑکی نے اس کے دل کو موہ لیا ہے، یا اللہ وہ کون ہوگی؟ —— میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟"

خود بے چارے گلفروش کو بھی ٹھیک معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ ہر روز حسین عورتیں دیکھتا تھا۔ اس نے تو سینکڑوں کے ہاتھوں میں گجرے پہنائے تھے۔ نازک اندام کلائیوں میں گجرے پہننے کے نئے نئے انداز سکھاتے تھے کتنی

شوخ نگاہوں کے وار سہے تھے۔ ہزاروں متبسم لبوں سے شہد کی طرح میٹھی بولیاں سنی تھیں۔ کسی کے گداز بازوؤں کے سڈول پن نے اُسے اتنا متاثر نہ کیا تھا۔ اور قوس قزحی ساڑھیوں کے خوشنما رنگ اس کے معصوم دل پر ہمیشہ سائے کیطرح گزر جاتے تھے۔ لیکن اب ایک لخت یہ کیا ہو گیا تھا ..... جب بال روم کو سجاتے وقت وہ بھی اس کے پاس آکر ایک دم کیلئے کھڑی ہو گئی تھی۔ تو اس کی آنکھیں کیوں جھپک گئی تھیں۔ سانس کیوں ایک لمحے کیلئے رک گئی تھی۔ اور جب وسطی فانوس کو لمبے لمبے ہاروں سے مزّین کرتے وقت اس کی انگلیاں اس کے ہاتھوں سے چھو گئی تھیں۔ تو اس کی رگوں کا خون کیوں آتشِ سیال بن گیا تھا۔ اور پھر..... جب ...... اُسے بال روم سجاتے دیکھ کر وہ ایک دم پیانو کیطرف چلی گئی تھی۔ تو وہ کیوں بیتاب ہو گیا تھا۔ اور یہ کس قدر عجیب احساس تھا کہ اسے پیانو بجاتے سن کر اُسے معلوم ہوا کہ کسی نے گویا اس کے دل کی تاروں پر اپنی انگلیاں رکھ دی ہیں۔ اور اُن میں سے ایک رنگین و حزیں نغمہ پیدا ہو گیا ہے۔

شاید یہی احساسِ محبت تھا۔ وہ احساس جو عمر میں صرف ایک بار پیدا ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے گلفروش کی آنکھوں میں آنسو

بھر آئے تھے۔ اور اس نے جلدی سے ایک کونے میں جا کر اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے

▲

اس امر کا صحیح اندازہ لگانا اگرچہ مشکل ہے کہ لڑکی کے دل پر گلفروش کے جذبات نے غیر شعوری طور پر کیا اثرات پیدا کئے۔

مگر یہ کہنے میں تو ذرا تامل نہیں کہ اب وہ اکثر اس کی دکان پر آیا کرتی تھی۔ یہی، پھولوں کے آویزے خریدنے کیلئے، گلدستے گجرے پسند کرنے کیلئے۔ لیکن یہ تو ایک اتنی معمولی سی بات تھی۔ جسے کوئی وقعت نہیں دی جاسکتی تھی۔ کالجوں کی کتنی ہی لڑکیاں روزانہ گلفروش کی دکان پر آیا کرتی تھیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب کیسے لیا جا سکتا ہے کہ وہ سب گلفروش سے محبت کرتی تھیں پھولوں سے محبت کرنے کا نتیجہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ باغ کے اُجڈ مالی سے محبت کی پینگیں بڑھالی جائیں۔ ایسی حماقت کون کریگا ؟۔ . . . اور صنفِ نازک تو ایسے معاملوں میں ہمیشہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ دانش مندی کا ثبوت دیتی ہے کون کہتا

ہے کہ گلفروش کبھی عقل مند نہ تھا. مگر اب تو نہ جانے اس کی عقل پر کیا پردہ پڑ گیا تھا. کہ جب وہ سفید ساڑھی باندھے ہوئے دکان میں داخل ہوتی اس کا دل خوشی کے مارے زور زور سے دھڑکنے لگتا، وہ سمجھتا کہ وہ خفیف سی مسکراہٹ جو اس کے رنگیں لبوں پر کبھی کبھی آجاتی تھی. صرف اسی کیلئے تھی. اس کی صندلی کلائیوں میں پڑی ہوئی نقرئی چوڑیوں کی میٹھی چھنچھناہٹ اسی کے کانوں کے لئے پیدا ہوئی تھی. اور سفید ساڑھی میں چھپے ہوئے کانوں میں گلاب کے پھولوں کے جھلملاتے ہوئے سرخ سرخ آویزے شاید اسی کی حریص نگاہوں کیلئے پہنے جاتے تھے شاید؟ . . . .

وہ کبھی کبھی خیال کر لیتا کہ وہ یقیناً اس سے محبت کرتی ہے کبھی کسی اندھیری رات میں جب کوئی اسے دیکھ نہ سکے، اس کی کوٹھی کے گرد چکر لگاتا اور مغربی سمت کے ایک کمرے میں روشنی دیکھ کر خوش ہوتا. اور پھر جب کبھی ایک چھریرا سا سایہ اس روشنی کے ایک طرف سے ہو کر دوسری طرف کو گزر جاتا تو اس کے دل کی حرکت یک بارگی تیز ہو جاتی. اور یکایک بجلی کے کھمبے کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس کرتا. پھر وہ دیر تک کھڑکی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا، حتیٰ کہ روشنی بجھ جاتی. اور اس کے دل میں ایک اندھیرا سا چھا جاتا اور وہ

اس گھبرائے ہوئے مسافر کیطرح جو اپنا راستہ بھول گیا ہو گھر کی راہ لیتا۔
اور اماں بیچاری دل میں روز کڑھتیں۔ ہائے اللہ میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟ رات دن کس فکر میں غلطان رہتا ہے۔ کہیں کسی کی نظر تو نہیں لگ گئی۔ کوئی آسیب؟ ...... پھر یکایک اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیتی اور سر جھکا کر چادر کاٹنے لگتی۔
اسی طرح چھ مہینے گزر گئے۔

ہ

ایک ابر آلود شام کو وہی موٹر جو آئی تو گل فروش نے دیکھا کہ بوڑھی عورت اکیلی بیٹھی تھی۔ گلفروش کے جھک کر سلام کرنے پر بوڑھی عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"کل دن کو بہت سے پھول اور ہار وغیرہ درکار ہوں گے اور رات کو بھی کوٹھی سج جا......"
"بہت اچھا سرکار،، گلفروش نے یہ کہہ کر ایک تیز نگاہ موٹر کی خالی سیٹ پر ڈالی۔
بوڑھی عورت نے پھر مسکرا کر کہا۔ "کل مسن ہرمزجی کی شادی ہے نا، بہت سے پھول چاہئیں۔"

موٹر چل دی. غریب گلفروش سر جھکائے رہ گیا.

دوسرے دن گلفروش کو ایسا معلوم ہوا کہ اسے ہلکا سا بخار ہے اس کا سر گھوم رہا تھا. مگر اسے آج تو بہت کام کرنا تھا، وہ بہت سویرے اُٹھا اور دکان پر کام کرنے چلا گیا۔ آج وہ نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا. اس کی محبوبہ کی شادی تھی. آج اس نے وہ وہ خوبصورت ہار اور گجرے تیار کئے. جو اس سے پہلے کبھی نہ کئے تھے۔ آج کی محبوبہ کی شادی تھی. اس نے پھولوں کو زریں تاروں میں الجھا کر نازک چادریں بنائیں. حسین گلدستے کلیوں کے چندن ہار تیار کئے۔ اور موتیا کے نیم وا پھولوں سے ایک خوب صورت مُکٹ تیار کیا. آج اس کی محبوبہ کی شادی تھی.

گلفروش نے کوٹھی کا کونہ کونہ پھولوں سے سجا دیا. وہ آج نہایت انہماک سے کام کر رہا تھا. کبھی اِدھر کبھی اُدھر بھاگا پھر رہا تھا۔ اپنے ملازموں کو ہدایات دیتا جاتا تھا. کتنی گہما گہمی، کتنی رونق تھی.

بوڑھی عورت مسکراتی ہوئی اِدھر سے اُدھر نکل جاتی. اور ایک سفید داڑھی والا گوری رنگت کا آدمی پہیوں والی آرام کرسی میں بیٹھا ہوا کرسی کا ہنڈل گھما کر اِدھر اُدھر دھکیلتا ہوا لے جا رہا تھا. ایک کمرے میں

اس نے اپنی محبوبہ کو بھی دیکھا تھا۔ وہ اپنے قبول سورت بھائی کے پاس بیٹھی — جھکی ہوئی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ اور پھر وہ دونوں آہستہ سے ہنس پڑے تھے۔ بھلا اسے دیکھ کر وہ گھبرا کر کیوں کھڑی ہو گئی تھی ایک لمحہ —— صرف ایک لمحہ کیلئے گلفروش نے اسے ملامت بار نگاہوں سے دیکھا۔ اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

کیا لڑکی کے نازک رنگین لب نرگس کیطرح زرد نہیں ہو گئے تھے اور کیا گلفروش نے واقعی اس کی نگاہ کی خطا واریاں دیکھ لی تھیں ؟ شاید یہ اس کا وہم ہی تھا، کیونکہ دوسرے لمحہ ہی میں وہ اپنے بھائی سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گئی تھی۔

کام کرتے کرتے شام ہو گئی۔ آسمان پر تارے نکل آئے کوٹھی میں برقی قمقمے روشن ہو گئے۔ آج دن بھر سے گلفروش بھوکا تھا، بھوکا ؟ نہیں۔ اسے بھوک لگی ہی نہ تھی۔ اب اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔ کوٹھی سج چکی تھی۔ بینڈ بج رہا تھا۔ گلفروش باغ کے ایک کونے میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ وہ کدھر جائے ؟ اسے چاروں طرف اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ . . . . . وہ جانے سے پہلے اپنی محبوبہ کو ایک لمحہ کیلئے دیکھ لینا چاہتا تھا۔ اس نے ایک نیلے سے رومال میں موتیا کے پھولوں کا بنا ہوا مکٹ لپیٹ رکھا تھا۔ کاش وہ اپنے

ہاتھوں سے یہ ٹکٹ اُسے پہنا سکتا اور پھر اس کے قدموں میں گر جاتا۔

...... بیوقوف گلفروش ۔!

رات کے نو بجے فلیش روڈ سے موٹریں چلنا شروع ہوئیں آگے آگے نوشہ کی کار تھی پھولوں سے سجی ہوئی۔ اس میں دولھا اور دلھن بیٹھے تھے۔ اس کے پیچھے پیچھے بیس تیس موٹریں ہارن بجاتی ہوئی آرہی تھیں۔ فلیش روڈ سے ٹرنگٹن روڈ تک تو لوگوں کا بہت ہجوم تھا۔ بلند قہقہے اور ہارنوں کی دلخراش آوازیں۔ موٹروں کے انجنوں کی گڑگڑاہٹ اور کسی آوارہ کتے کا بھونکنا......

خدا خدا کر کے جب ٹرنگٹن روڈ گزر گئی تو موٹروں نے تیز ہونا شروع کیا۔ اور جب خاپ روڈ آگئی تو نوشاہ کی کار خوشی سے اُڑی جارہی تھی۔ یہاں ایک خوشگوار سا اندھیرا تھا۔ بجلی کے کھمبے بھی دور دور تھے اور دو رویہ گھنے دار درخت کھڑے تھے۔

یکایک نوشاہ کو سامنے سے ایک شخص بھاگتا ہوا نظر آیا۔ اس کے بازو کھلے تھے۔ اور وہ عین موٹر کی سمت دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ نوشاہ نے زور سے ہارن بجایا۔ اور موٹر کو ایک طرف کرنا چاہا۔ اس نے

بریک بھی دبائی۔ مگر آہ یہ سب کچھ بہت دیر سے ہوا۔ وہ پاگل شخص موٹر کے نیچے آچکا تھا۔ اس کی چھاتی اور بائیں بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ دلھن ایک دلخراش چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

۵

نوشاہ اور موٹروں میں بیٹھے ہوئے اور لوگ کر بھی کیا سکتے تھے۔ اسے اٹھا کر اسی دم ہسپتال میں لے گئے۔ زخمی کو فی الفور آپریشن روم میں لے جایا گیا۔ باہر کمرے میں سب لوگ بیٹھے ہوئے سوچنے لگے آہ۔ بیچارے کو بہت چوٹ آئی ہے۔ وہ کیوں موٹر کے نیچے آگیا وہ کون ہے؟ کیا وہ بچ جائے گا۔؟ آخر ایک لمبے عرصے کے بعد ڈاکٹر باہر آیا اور نوشاہ سے کہنے لگا۔ "آخری لمحوں پر ہے تمھاری مسز کو بلاتا ہے"

گلفروش میز پر لیٹا ہوا تھا۔ چھاتی پر پٹی بندھی تھی۔ جو خون سے سرخ ہو چکی تھی، لڑکی کو دیکھ کر اس کے زرد چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے لڑکی کی جانب اپنا داہنا ہاتھ بڑھایا۔ آہ! اس ہاتھ کی لرزتی ہوئی انگلیوں نے اسی موتیا کے مکٹ کو تھام رکھا تھا۔ مکٹ خون آلود تھا۔ پھول والے

نے اپنے پھولوں کے ساتھ خون کی ہولی کھیلی تھی۔ کس لئے ؟ کیا اس ملاقات کے لئے ؟ ——— بیوقوف گلفروش !

لڑکی نے ایک قلیل وقفہ کیلئے گلفروش کی طرف دیکھا۔ گلفروش کا سر اس کی چھاتی پر جھک گیا اور لڑکی نے دونوں ہاتھ بڑھا کر ٹمکٹ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ جیسے کوئی کسی معصوم یتیم بچے کو اپنی گود میں لے لے۔ گل فروش کا بازو آہستہ سے میز پر گر گیا۔ اس نے اپنی روح کی پوری قوت سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسّم نمودار ہوا۔ یہ چراغِ سحری کی جھلملاتی ہوئی لو تھی۔

گل فروش کا اکھڑا ہوا سانس مدھم ہو گیا۔ ڈاکٹر نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ گل فروش کے لب کانپے، ہلکی ہلکی ایک دو ہچکیاں آئیں

چراغ بجھ گیا !

لڑکی رونے لگی۔

" یہ کون تھا ؟ " ڈاکٹر نے آہستہ سے پوچھا۔

کوئی اس کے نام سے واقف نہ تھا ...... نوشاہ روتی ہوئی دلھن کو بازوؤں میں تھام کر باہر لے گیا۔

ڈاکٹر نے اپنے شانوں کو ایک خفیف سی حرکت دی۔ اور
نرس سے بولا۔ " دوسرا مریض لاؤ۔"

دنیا کے اس بھرے ہسپتال میں یہی ہوتا ہے۔ جب
ایک مریض مرجاتا ہے تو دوسرا مریض اس کی جگہ فوراً آجاتا ہے۔

۸

اس حادثے کے چند دنوں بعد گل فروش کا چھوٹا بھائی اپنی
دکان پر دانار کلی کے سرے کے قریب)، توتلی زبان میں گجرے اور پھول
بیچ رہا تھا۔ اور ایک چھوٹی سی لڑکی اپنے باپ کی انگلی پکڑے ہوئے
اسے نہایت دل آویز لہجے میں مجبور کر رہی تھی کہ وہ اِسے ننھے
گلفروش کی دکان سے چنبیلی کے پھولوں کے دو ننھے آویزے
خرید دے۔

دو فرلانگ لمبی سڑک

پھریوں سے لے کر لا کالج تک بس یہی کوئی دو فرلانگ لمبی سڑک ہوگی۔ ہر روز مجھے اسی سڑک پر سے گزرنا ہوتا ہے۔ کبھی پیدل، کبھی سائیکل پر۔ سڑک کے دو رویہ شیشم کے سوکھے سوکھے اداس سے درخت کھڑے ہیں۔ ان میں نہ حسن ہے نہ چھاؤں، سخت کھردرے تنے اور ٹہنیوں پر گدھوں کے جھنڈ۔ سڑک صاف سیدھی اور سخت ہے۔ متواتر نو سال سے میں اس پر چل رہا ہوں، نہ اس میں کبھی کوئی گڑھا دیکھا ہے۔ نہ شگاف، سخت سخت پتھروں کو کوٹ کوٹ کر یہ سڑک تیار کی گئی ہے۔ اور اب اس پر کولتار بھی بچھی ہے۔ جس کی عجیب سی بو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے۔

سڑکیں تو میں نے بہت دیکھی بھالی ہیں۔ لمبی لمبی، چوڑی چوڑی سڑکیں، بُرادے سے ڈھنپی ہوئی سڑکیں، سڑکیں جن پر سرخ بجری بچھی ہوئی تھی۔ سڑکیں جن کے گرد سرو، شمشاد کے درخت کھڑے تھے، سڑکیں ——— مگر نام گنانے سے کیا فائدہ۔ اس طرح تو ان گنت سڑکیں دیکھی ہوں گی۔ لیکن جتنی اچھی طرح میں اس سڑک کو جانتا ہوں، کسی اپنے گہرے دوست کو بھی اتنی اچھی طرح نہیں جانتا۔

متواتر نو سال سے اسے جانتا ہوں، اور ہر صبح اپنے گھر سے جو چھبریوں کے قریب ہی ہے اُٹھ کر دفتر جاتا ہوں جو لاء کالج کے پاس ہی ہے۔ بس یہی دو فرلانگ کی سڑک، ہر صبح اور ہر شام چھبریوں سے لیکر لاء کالج کے آخری دروازے تک، کبھی سائیکل پر کبھی پیدل۔

اس کا رنگ کبھی نہیں بدلتا۔ اس کی ہیئت میں تبدیلی نہیں آتی۔ اس کی صورت میں روکھاپن بدستور موجود ہے جیسے کہہ رہی ہو مجھے کسی کی کیا پرواہ ہے۔ اور یہ ہے بھی سچ۔ اسے کسی کی پرواہ کیوں ہو؟ سینکڑوں، ہزاروں انسان گھوڑے، گاڑیاں موٹریں اس پر سے ہر روز گزر جاتی ہیں اور پیچھے کوئی نشان باقی

نہیں رہتا۔ اس کی ہلکی نیلی اور سانولی سطح اسی طرح سخت اور سنگلاخ ہے جیسی پہلے روز تھی۔ جب ایک یوریشین ٹھیکیدار نے اسے بنایا تھا۔

یہ کیا سوچتی ہے؟ یا شاید یہ سوچتی ہی نہیں، میرے سامنے ہی ان نو سالوں میں اس نے کیا کیا واقعات، حادثے دیکھے۔ ہر روز ہر لمحہ کیا نئے تماشے نہیں دیکھتی، لیکن کسی نے اسے مسکراتے نہیں دیکھا۔ نہ روتے ہی۔ اس کی پتھریلی چھاتی میں کبھی ایک درز بھی پیدا نہیں ہوئی۔

" ہائے بابو، اندھے محتاج، غریب فقیر پر ترس کر جاؤ رے بابا۔ اے بابو، خدا کیلئے ایک پیسہ دیتے جاؤ رے بابا، ارے کوئی بھگوان کا پیارا نہیں، صاحب جی میرے ننھے بچے بلک رہے ہیں، ارے کوئی تو ترس کھاؤ ان یتیموں پر۔"

بیسیوں گداگر اسی سڑک کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی اندھا ہے تو کوئی لنجا۔ کسی کی ٹانگ پر ایک خطرناک زخم ہے تو کوئی غریب عورت دو تین چھوٹے چھوٹے بچے گود میں لئے حسرت بھری نگاہوں سے راہگیروں کیطرف دیکھتی جاتی ہے۔ کوئی پیسہ دے دیتا ہے۔ کوئی تیوری چڑھائے گزر جاتا ہے، کوئی

گالیاں دے رہا ہے، حرامزادے، مسٹنڈے کام نہیں کرتے بھیک مانگتے ہیں۔

کام، بے کاری، بھیک،

دو لڑکے سائیکل پر سوار ہنستے ہوئے جا رہے ہیں، ایک بوڑھا امیر آدمی اپنی شاندار فٹن میں بیٹھا سڑک پر بیٹھی ہوئی بھکارن کی طرف دیکھ رہا ہے اور اپنی انگلیوں سے مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے۔ ایک سست مضمحل کتا فٹن کے پہیوں تلے آگیا ہے۔ اس کی پسلی کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ لہو بہ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کی افسردگی، بے چارگی، اس کی ہلکی ہلکی دردناک ٹیاؤں ٹیاؤں کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔

بوڑھا آدمی اب گدیلوں پر جھکا ہوا اس عورت کی طرف دیکھ رہا ہے جو ایک خوشنما سیاہ رنگ کی ساڑھی زیب تن کئے اپنے نوکر کے ساتھ مسکراتی ہوئی باتیں کرتی جا رہی ہے۔ اس کی سیاہ ساڑھی کا نقرئی حاشیہ بوڑھے کی حریص آنکھوں میں چاند کی کرن کی طرح چمک رہا ہے۔

٭ ٭ ٭

پھر کبھی سڑک سنسان ہوتی ہے۔ صرف ایک جگہ شیشم کے درخت کی چھدری چھاؤں میں ایک تانگے والا گھوڑے کو سستا رہا ہے۔ گدھ دھوپ میں ٹہنیوں پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ پولیس کا سپاہی آتا ہے، ایک زور کی سیٹی، او ٹانگے والے یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے۔ کیا نام ہے تیرا، کردوں چالان؟ ہجور، "ہجور کا بچہ! چل تھانے، ہجور؟ یہ تھوڑا ہے، اچھا جا تجھے معاف کیا۔

تانگے والا تانگے کو سرپٹ دوڑائے جا رہا ہے۔ راستے میں ایک "گورہ" آ رہا ہے۔ سر پر ٹیڑھی ٹوپی ہاتھ میں بید کی چھڑی۔ رخساروں پر پسینہ، لبوں پر کسی ڈانس کا سُر۔

"کھڑا کر دو، کنٹونمنٹ،"

"آٹھ آنے صاب۔"

"ول، چھ آنے۔"

"نہیں صاب۔"

"کیا بکتا ہے، ٹم......"

تانگے والے کو مارتے مارتے بید کی چھڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ پھر تانگے والے کا چمڑے کا ہنٹر کام آتا ہے۔ لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ پولیس کا سپاہی بھی پہنچ گیا ہے۔ حرامزادے، صاحب

بہادر سے معافی مانگو، تانگے والا اپنی میلی پگڑی کے گوشے سے آنسو پونچھ رہا ہے. لوگ منتشر ہو جاتے ہیں.

اب سڑک پھر سنسان ہے.

شام کے دھندلکے میں بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے. میں نے دیکھا کہ کچہریوں کے قریب چند مزدور بال بکھرے، میلے لباس پہنے باتیں کر رہے ہیں.

" بھیّا بھرتی ہو گیا؟"

" ہاں."

" تنخواہ تو اچھی ملتی ہو گی؟"

" ہاں."

" بڑھئو کے لئے کما لائے گا. پہلے بیوی تو ایک ہی پھٹی ساڑھی میں رہتی تھی."

" سنا ہے جنگ شروع ہونے والی ہے."

" کب شروع ہو گی؟"

" کب اس کا تو پتہ نہیں، مگر ہم غریب ہی تو مارے جائیں گے."

" کون جانے غریب مارے جائیں گے کہ امیر؟"

" ننھا کیسا ہے ؟ "

" بخار نہیں ٹلتا، کیا کریں، اِدھر جیب میں پیسے نہیں ہیں اِدھر حکیم سے دوا . . . . "

" بھرتی ہو جاؤ ۔ "

" سوچ رہے ہیں ۔ "

رام . رام

رام . رام .

پھٹی ہوئی دھوتیاں، ننگے پاؤں، تھکے ہوئے قدم، یہ کیسے لوگ ہیں، یہ نہ تو آزادی چاہتے ہیں نہ حرّیت، یہ کیسی عجیب باتیں ہیں۔ پیٹ، بھوک، بیماری، پیسے، حکیم کی دوا، جنگ۔

قمقموں کی زرد زرد روشنی سڑک پر پڑ رہی ہے۔

دو عورتیں، ایک بوڑھی ایک جوان، اُپلوں کے ٹوکرے اُٹھائے خچروں کی طرح ہانپتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ جوان عورت کی چال تیز ہے۔

" بیٹی ذرا ٹھہر تو ۔ " بوڑھی عورت کے چہرے پر بیشمار جُھریاں ہیں۔ اس کی چال مدھم ہے۔ اس کے لہجے میں بیکسی ہے

" بیٹی، میں، ذرا ٹھہر، میں تھک گئی . . . . میرے اللہ ! "

" اماں، ابھی گھر جا کر روٹی پکانی ہے، تو تو باولی ہوئی ہے"

" اچھا بیٹی، اچھا بیٹی۔"

بوڑھی عورت جوان عورت کے پیچھے بھاگتی ہوئی جا رہی ہے۔ بوجھ کے مارے اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔

وہ صدیوں سے اسی سڑک پر چل رہی ہے۔ اُپلوں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے۔ کوئی اس کا بوجھ ہلکا نہیں کرتا۔ کوئی اُسے ایک لمحہ سستانے نہیں دیتا۔ وہ بھاگتی ہوئی جا رہی ہے۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔ اُس کی جھریوں میں غم ہے۔ اور بھوک اور فکر اور غلامی اور صدیوں کی غلامی!

تین چار نوخیز لڑکیاں، بھڑکیلی ساڑھیاں پہنے، باہوں میں باہیں ڈالے ہوئے جا رہی ہیں

بہن، آج شملہ پہاڑی کی سیر کریں۔

بہن، آج لارنس گارڈن چلیں۔

بہن، آج انارکلی،

ریگل؟

شٹ اپ یُو فول

۱

آج سڑک پر سرخ جلوان بچھا ہے، آر پار جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں۔ جا بجا پولیس کے سپاہی کھڑے ہیں۔ کسی بڑے آدمی کی آمد ہے۔ جبھی تو سکولوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے نیلی پگڑیاں باندھے سڑک پر دُورویہ قطاروں میں کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہیں۔ ان کے لبوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں۔ ان کے چہرے دھوپ کی حدّت سے تمتما اُٹھے ہیں اسی طرح کھڑے کھڑے وہ ڈیڑھ گھنٹہ سے بڑے آدمی کا انتظار کر رہے ہیں۔

جب وہ پہلے پہلے یہاں سڑک پر کھڑے ہوئے تھے تو ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اب سب چُپ ہیں۔ چند لڑکے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے تھے۔ استاد اب اُنھیں کان سے پکڑ کر اُٹھا رہے ہیں۔ شفیع کی پگڑی کھل گئی تھی۔ اُستاد اُسے گھور کر کہہ رہا ہے۔" او شفی پگڑی ٹھیک کر، پیارے لال کی شلوار اس کے پاؤں میں اٹک گئی ہے اور

ازار بند جوتیوں تک لٹک رہا ہے۔ "تمھیں کتنی بار سمجھایا ہے پیارے لال۔!"

"ماسٹر جی پانی!"

"پانی کہاں سے لاؤں، یہ بھی تم نے اپنا گھر سمجھا رکھا ہے"

دو تین منٹ اور انتظار کرو، بس ابھی چھٹی ہوا چاہتی ہے۔"

"دو منٹ، تین منٹ، آدھ گھنٹہ۔"

"ماسٹر جی، پانی،

ماسٹر جی، پانی،

ماسٹر جی بڑی پیاس لگی ہے۔"

لیکن استاد اب اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ وہ ادہر اُدہر دوڑتے پھر رہے ہیں۔ لڑکو ہوشیار ہو جاؤ۔ دیکھو جھنڈیاں اس طرح ہلانا۔ ابے تیری جھنڈی کہاں ہے؟ قطار سے باہر ہو جا، بدمعاش کہیں کا...... سواری آرہی ہے۔

موٹر سائیکلوں کی پھٹ پھٹ، بینڈ کا شور، پتلی اور چھوٹی جھنڈیاں بے دلی سے ہلتی ہوئی۔ سوکھے ہوئے گلوں سے پژمردہ نعرے۔

بڑا آدمی سڑک سے گزر گیا، لڑکوں کی جان میں جان

آ گئی ہے۔ اب وہ اچھل اچھل کر جھنڈیاں توڑ رہے ہیں۔ شور مچا رہے ہیں۔

خوانچے والوں کی صدائیں۔ ریوڑیاں، گرم گرم چنے، حلوا پوری، نان کباب۔

ایک خوانچے والا ایک طرّے والے بابو سے جھگڑ رہا ہے مگر آپ نے میرا خوانچہ الٹ دیا۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گا میرا تین روپے کا نقصان ہو گیا۔ میں غریب آدمی ہوں، میرا نقصان پورا کر دیجئے تو میں جانے دوں گا۔"

۵

صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں بھنگی سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے اس کے منہ اور ناک پر کپڑا بندھا ہے جیسے بیلوں کے منہ پر جب وہ کولھو چلاتے ہیں۔

میونسپلٹی کا پانی والا چھکڑا آہستہ آہستہ سڑک پر چھڑکاؤ کر رہا ہے چھکڑے کے آگے جُتے ہوئے دو بیلوں کی گردنوں پر زخم پیدا ہو گئے ہیں۔ چھکڑے والا سردی سے ٹھٹھرتا ہوا کوئی

گیت گانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بلیوں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ابھی سڑک کا کتنا حصہ باقی ہے۔

سڑک کے کنارے ایک بوڑھا گداگر مرا پڑا ہے۔ اس کے میلے دانت ہونٹوں کے اندر دھنس گئے ہیں۔ اس کی کھلی ہوئی بے نور آنکھیں آسمان کی طرف تک رہی ہیں۔

خدا کیلئے مجھ غریب پر ترس کر جاؤ رے بابا۔

کوئی کسی پر ترس نہیں کرتا۔ سڑک خاموش اور سنسان ہے۔ یہ سب کچھ دیکھتی ہے۔ سنتی ہے۔ مگر ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ انسان کے دل کی طرح بے رحم بے حس اور وحشی ہے۔

انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اکثر میں سوچتا ہوں کہ اگر اسے ڈائنامیٹ لگا کر اڑا دیا جائے تو پھر کیا ہو، ایک بلند دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے فضا میں پرواز کرتے نظر آئیں گے۔ اس وقت مجھے کتنی مسرت حاصل ہو گی اور اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔

کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہو جاتا ہوں، چاہتا ہوں کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر ننگا سڑک پر ناچنے لگوں اور چلا چلا کر کہوں میں انسان نہیں ہوں، میں پاگل ہوں۔

مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔ مجھے انسانوں سے نفرت ہے
مجھے پاگل خانے کی غلامی بخش دو۔ میں ان سڑکوں کی آزادی نہیں
چاہتا۔

۸

سڑک خاموش ہے اور سنسان، بلند ٹہنیوں پر گدھ بیٹھے
اونگھ رہے ہیں۔

یہ دو فرلانگ لمبی سڑک !

بندوالی

وہ دھان کوٹنے والی تھی۔ اور بند کے آس پاس رہتی تھی۔ میں اسی ہوس بوٹ کی چھت پر بیٹھ کر اسے دیکھا کرتا تھا۔ اس واقعہ کو کم و بیش تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ میں اور بڑے بھائی جان اور بھابی جان پہلی دفعہ سرینگر آئے تھے۔ ڈاکٹروں نے بھابی جان کے خون کا دباؤ خطرناک طور پر زیادہ بتایا تھا۔ اور گرمیوں میں کشمیر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ ہمیں یہاں آئے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ مگر اب تک میں اس کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ ہر روز اسے چھت پر سے دیکھتا تھا۔ اور ہر روز دھان کوٹنے میں مصروف پاتا۔ مگر اس مصروفیت کے باوجود ہماری آنکھیں چار ہو جایا کرتی تھیں۔ کشمیری حسن یوں بھی تو بہت مشہور ہے مگر اس

لڑکی میں ایسی عجیب دل کشی، بانکپن اور دل آویزی تھی کہ کچھ بیان ہی نہیں کر سکتا۔ یوں تو اس کے ہاتھ اور ٹخنے عموماً میلے ہوتے تھے اور لباس بھی بوسیدہ اور جابجا سے تار تار۔ لیکن اس کے بے داغ حسن کی فراوانی نے افلاس کی کم مائیگی اور بے چارگی کو ڈھانپ لیا تھا۔

اس کے حسن میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ میرا دل بے اختیار اس کی طرف کھچا چلا جاتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ میں ہی اُسے ہر وقت دیکھتا تھا۔ وہ بھی کسی وقت جب میں کوئی ناول پڑھنے میں مشغول ہوتا یا غروبِ آفتاب کے وقت دریا میں تیرتے ہوئے شکاروں کیطرف دیکھ رہا ہوتا۔ میری طرف دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھ لیا کرتی۔ اور پھر جب یکایک ہماری نگاہیں ایک دوسرے سے ملتیں۔ تو وہ کسی قدر شرما جاتی۔ اٹھا ہوا موسل آہستہ سے اوکھلی میں گر جاتا۔ اور لانبی لانبی پلکیں شرمگیں رخساروں کو چھو جاتیں۔ ہر روز اسی طرح نظارہ بازی ہوتی تھی۔ میں خوش تھا اور دل میں سمجھتا تھا کہ اس راز سے اور کوئی آگاہ نہیں۔ اس لئے ایک روز مجھے بہت حیرانی ہوئی جب میرے نوکر رحمٰن نے مجھے آکر سنایا کہ بھائی جان پوچھتی تھیں کہ یہ سامنے بند والی لڑکی ہر وقت اوپر کیوں دیکھتی رہتی ہے ـــــ اور یہ کہہ کر کم بخت مسکرانے لگا۔ معلوم نہیں سچ کہنا تھا یا جھوٹ۔ مگر مجھے بھابی

جان سے پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

ایک شام کا ذکر ہے میں سیر سے واپس آ رہا تھا کہ بند کے اس طرف جہاں چیالال اور شاہ بلوط کے بڑے بڑے گھنے اور قد آور درخت کھڑے ہیں وہ مجھے یکایک مل گئی۔ اور مجھے دیکھتے ہی ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ خوب بنی ٹھنی تھی۔ ایک تنگ نیلے رنگ کا پیرہن پہنے تھی۔ جو اس کے تناسب اعضاء کو اچھی طرح نمایاں کر رہا تھا۔ ٹخنے تو نظر نہیں آتے تھے۔ لیکن ہاتھ آج غیر معمولی طور پر صاف تھے اور بے داغ۔ دودھ جیسی سپید گردن میں لڑیوں میں پروئے ہوئے سرخ منکے نہایت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ سرخ و سپید رخسار چمک رہے تھے۔ اور ان آنکھوں کی نیلی گہرائیوں کو کیا کہوں جنھیں دیکھ کر ڈل میں کھلے ہوئے کنول کے پھول یاد آجاتے ہیں۔

——— میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور مسکرا کر پوچھا۔ "کدھر جا رہی ہو؟"

اس نے شرما کر ہاتھ چھڑانے کی ایک ناکام سی کوشش کی اس کے پتلے پتلے لب کانپے جس طرح ببول کی پتیاں ہوا میں کانپتی ہیں۔ مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی ——— میں اُسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا چنار کے درختوں کی طرف لے چلا۔ وہ "نا۔ نا" کرتی

جا رہی تھی اور مجھ سے لپٹتی جا رہی تھی۔

ایک بڑے چنار کے نیچے ہم جا کر بیٹھ گئے۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کو چوم کر کہا۔ "مجھے تم سے محبت ہے اے بندوالی دوشیزہ مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے۔ بیشک میں جھوٹ بول رہا تھا۔ لیکن میں تو اُسے اپنا حق سمجھتا تھا۔ یوں بھی تو محبت میں صداقت خدا نے عورتوں ہی کو ودیعت کی ہے۔

اس نے سحر طراز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور باریک سی آواز میں کچھ کہا مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ کشمیری زبان میں بول رہی تھی۔ بہر حال اس کا لب ولہجہ نہایت دلکش تھا۔

"ادھر دیکھو۔" میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا "مجھے۔ تم ۔ سے محبت ہے" میں رک رک کر اسے عاشقوں کی زبان میں سمجھا رہا تھا ۔ ۔ ۔ میرا ۔ ۔ ۔ ۔ نام ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے ہاتھ کے اشاروں سے بتلاتے ہوئے کہا۔ میرا نام فیروز ہے سمجھتی ہو نا؟ میرا نام فیروز ہے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمھارا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نام ۔ ۔ ۔ کیا ہے ؟"

معلوم نہیں اس نے کیا سمجھا۔ وہ جلد جلد اپنی زبان میں کچھ کہنے لگی۔ وہ نہایت روانی سے اور غالباً نہایت فصاحت سے

بول رہی تھی۔

الفت، جھی، شوہر یہی تین لفظ میری سمجھ میں آئے۔ بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے اس کے آنسو پونچھ ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس نے جھٹ منہ پھیر لیا اور ——— اور بھی زور سے رونے لگی۔ وہ ایک معصوم بچے کیطرح رونے پر گویا تلی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر میں نے بھی اسے بچوں کیطرح گدگدانا شروع کیا۔ اور اتنا گدگدایا کہ وہ روتی ہوئی مسکرا پڑی۔ اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

"اب کہو۔" میں نے اسے ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا پھر رووٴ گی؟" جیسے وہ میری بات سمجھ گئی۔ اس نے انکار میں سر ہلادیا۔

کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دور کہیں کہیں تارے جھلملا رہے تھے۔ اور چنار کی پھیلی ہوئی ٹہنیوں کے درمیان بچارا مہ نو بھی کسی دوشیزہ کے ٹوٹے ہوئے کنگن کی طرح اٹک کر رہ گیا تھا۔ ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے آرہے تھے اور ان کے دوش پر شکارے چلاتے ہوئے مانجیوں کی پرکیف صدائیں لرزہ خیز تھیں۔

میں نے کشمیری دوشیزہ کی طرف حریصانہ نگاہوں سے دیکھا
اپنی باہیں اس کی کمر میں ڈالدیں کہ اُسے اپنی آغوش میں لے لوں
اس نے آہستہ مگر مصمم ارادے سے اپنے آپ کو میری گرفت سے
چھڑالیا۔ اور سرزنش کے انداز میں مجھ سے کچھ کہنے لگی۔

صرف دو لفظ میری سمجھ میں آئے۔ گناہ .... گناہ ....

میری جان! میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے
کہا۔ اگر یہ گناہ ہے تو ہوا کرے۔ یہ گناہ محبت ہے۔

اس نے تڑپ کر ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو چھڑالیا
اور میری طرف شعلہ بار نگاہوں سے دیکھ کر کچھ کہنے لگی۔ غالباً ملامت
کررہی تھی۔ میں سر جھکائے سن رہا تھا۔ بیکس و مجبور ہو کر سر جھکائے
سن رہا تھا۔

شاید اُسے مجھ پر کچھ رحم آگیا۔ اس نے میری طرف
عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ اپنے بازو میری گردن میں ڈالدیئے۔
اور میرے کان میں کچھ پیارے پیارے الفاظ کہہ کر بھاگ گئی۔
چنار اور بلوط کے درختوں میں سے گزرتی ہوئی یہ جا وہ جا، ایک
دم غائب ہوگئی۔

میں کچھ دیر ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے اُٹھا۔

اپنی چھڑی اٹھائی۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔

یار تم نرے گدھے ہو۔ گدھے اور احمق اور اُلو!

۸

دوسرے دن دوپہر کو میں چھت پر چڑھا۔ اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن جانِ آرزو کہیں نظر نہ آئی۔ اوکھلی منہ کھولے پڑی تھی۔ اور ساتھ ہی موسل بھی ٹیڑھا پڑا ہوا دھوپ سینک رہا تھا۔ نہ دھان کی بوری کہیں نظر آتی تھی۔ نہ دھان کوٹنے والی۔ میں حیران تھا اور ولکاکس کا ایک ناول گھٹنوں پر رکھے یوں ہی سوچ رہا تھا۔ آج دھوپ کتنی فرحت بخش ہے۔ وہ آج کدھر چلی گئی ہے۔ کہیں بیمار نہ پڑ گئی ہو۔ دریا کا پانی آج کس طرح نیلم کی طرح چمک رہا ہے۔ وہ نیلا پیراہن اسے کتنا بھلا معلوم دیتا تھا۔ اور وہ گلے میں سرخ منکے مگر ہے بہت شوخ و شنگ۔ میں اسے جتنی بھولی سمجھتا تھا۔ وہ اتنی ہی طرار نکلی۔

رحمٰن میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے ابرو استفہامیہ انداز میں اوپر اٹھائے۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ آج فرزی کو خوب مار پڑی۔ فرزی؟ فرزی؟ کون۔ فرزی؟

رحمٰن نے بند کی طرف اشارہ کیا۔ وہی دھان کوٹنے

والی فریزی ۔۔۔ فریزی۔ میں نے آہستہ سے دل میں دہراتے ہوئے کہا۔ خوبصورت نام ہے فریزی ۔۔۔۔ فیروز ۔۔۔ فریزی۔ ولکاکس سے تو بدرجہا اچھا ہے۔ اونہہ! ولکاکس بھی بھلا کوئی نام ہے؟

اور رحمٰن آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ اس کے باپ نے۔ اس کے بھائی نے۔ اور اس کے ہونے والے شوہر نے اِسے خوب ہی پیٹا۔ کل شام کو پتہ نہیں وہ کدھر چلی گئی تھی۔ اور بہت دیر کے بعد واپس آئی تھی۔ ان عورتوں کا کیا اعتبار ہے۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے اس کے منگیتر نے اس کے لئے ایک نیلا ریشمی چغہ خریدا تھا کہ وہ اُسے نکاح کے روز پہنے۔ کم بخت وہی نیلا چغہ پہن کر کہیں چلی گئی۔ گویا کہیں اپنا بیاہ رچانے جا رہی تھی۔ ان عورتوں کا کیا اعتبار ہے۔ مگر آج پٹی بھی خوب ہے عمر بھر یاد رکھے گی۔

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" میں نے گرج کر کہا۔ "دور ہو جاؤ یہاں سے۔ میں نے تم سے کب کہا ہے کہ فریزی اور اس کے منگیتر کے قصے یوں مجھے آکر سناؤ؟" یہ کہہ کر میں نے کتاب کو زور سے کھولا اور اُسے نہایت توجہ سے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

گو میں نے نگاہ اوپر نہ اُٹھائی۔ لیکن بخوبی جان گیا تھا کہ شیطان میری طرف دیکھ کر ہنس رہا ہے۔ میں نے اس کی طرف مزید

توجہ دینی مناسب نہ سمجھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے اس کے واپس چلے جانے کی چاپ سنائی دی۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو سامنے فرنری کھڑی تھی۔ ایک ہاتھ میں دھانوں سے بھرا ہوا تھیلا پکڑے تھی۔ اور دوسرے ہاتھ سے بار بار آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ ہاں وہ رو رہی تھی۔ اور مجھے دیکھ کر اور بھی زور زور سے رونے لگی۔

میں نے پریشان ہو کر اپنی نگاہیں پھیر لیں۔ یہ لڑکی تو مجھے مفت میں بدنام کرے گی۔ میں بھلا اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں کم بخت روئے جاتی ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ کتنی اجڈ ہے اور گنوار۔ کس طرح میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے اور روئے جاتی ہے۔ مجھے نیچے ہی چلنا چاہیئے۔ میں اپنے دل میں اپنی غلطی پر پچھتا رہا تھا۔ اور اس بیوقوف لڑکی کو کوس رہا تھا۔

میں نے کتاب اُٹھائی۔ کرسی کو تہ کیا اور اسے بازو میں لٹکائے ہوئے فرنری کیطرف نگاہ کئے بغیر نیچے اُتر گیا۔ نچلی منزل میں زینے کے قریب بھابی جان کھڑی تھیں۔ کہنے لگیں

"نیچے اُتر آئے ہو دھوپ تیز ہو گئی ہے؟"

میں نے جلدی سے کہا۔ "اور سر میں ہلکا سا درد بھی محسوس کرتا ہوں۔" تمام دن بستر پر لیٹا رہا۔ اور پھر جتنے دن سرینگر میں رہا۔

کبھی چھت پر نہیں گیا۔ سات آٹھ روز اسی طرح رہنے کے بعد میں نے بھائی صاحب سے صاف کہہ دیا کہ میرا تو اب یہاں دل نہیں لگتا۔

"واپس شجاع آباد چلے جاؤ۔"

"بہت اچھا۔" میں نے کہا اور دوسرے ہی دن سرینگر سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

٭ ٭ ٭

اتنا کہہ کر فیروز خاموش ہو گیا اور ہوس بوٹ کے ڈرائنگ روم کے دریچے سے باہر دیکھنے لگا۔

بس ؟ میں نے آہستہ سے پوچھا۔ مجھے غیر محسوس طریقہ پر یقین ہو گیا تھا کہ داستان کا دلچسپ حصّہ ابھی باقی ہے۔ اس لئے کچھ توقف کے بعد میں نے پھر استفسار کیا۔ بس ؟

فیروز نے آہستہ سے ایک سگار سلگایا۔ ایک دو کش لگائے۔ اور دھوئیں کے مرغولے ہوا میں چھوڑتے ہوئے رک رک کر کہنے لگا۔

"نہیں ...... تو .... اچھا ..... بقیہ بھی سن لو۔"

٭ ٭ ٭

گھر پہنچ کر بھی میرا دل نہ لگا۔ ہر وقت پریشانی سی رہتی تھی۔ اور دل میں ہر آن کچھ عجیب سی بے چینی اور بے کلی پاتا تھا۔ کچھ عجیب ہی حالت تھی کہ جس کا ہر بار تجزیہ کرنے پر بھی کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ کبھی سوچتا میں نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔ کبھی سوچتا، میں نے جو کچھ کیا موقع و محل کے مطابق وہ ٹھیک تھا اور اگر ایسا نہ کرتا تو شاید۔ اس گنوارن کے لئے اپنی آبرو مٹی میں ملا لیتا۔ اور پھر یکایک اس گنوارن کا بھولا بھالا روتا ہوا چہرہ سامنے آجاتا۔ دل میں ایک کسک سی ہوتی۔ اور میں بے اختیار اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتا۔ پھر اپنے آپ کو تسلی دیتا۔ میں نے آخر کیا ہی کیا۔

جہاں تک میرا خیال ہے میں نے ہرگز کوئی گناہ نہیں کیا۔ کم از کم اس معاملے میں تو میرا ضمیر صاف ہے۔ مگر پھر وہی روتا ہوا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔ اور ان نیلی آنکھوں سے بہتے ہوئے طوفان کے آگے میری سب طفل تسلیاں ریت کی دیوار کی طرح بہ جاتیں۔

اسی طرح ڈیڑھ ہفتہ اور گزر گیا۔ خزاں آئی اور خزاں کے آتے ہی بھائی صاحب اور بھابی جان بھی سرینگر سے آگئے میں اسٹیشن پر انھیں لینے گیا تھا۔ بھابی جان اب بالکل اچھی ہو

گئی تھیں اور ان کے بشاش اور پر رونق چہرے کو دیکھ کر ایک لمحے کیلئے مجھے بہت مسرت ہوئی۔ دوسرے لمحے ہی میں نہ جانے کیوں میں اداس ہوگیا۔ آدمی کی نفسیاتی زندگی میں پروازِ خیال بھی عجیب چیز ہے۔ بھابی جان کو دیکھتے ہی فریزی یاد آگئی کتنی عجیب بات تھی۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ پلیٹ فارم پر کھڑے میں صاف اور واضح طور پر فریزی کے ملول چہرے اور اندوہگیں آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ یا شاید یہ سب واہمہ ہی تھا۔ بھائی صاحب نے میرا چہرہ یکایک اترا ہوا دیکھ کر کہا۔ کس سوچ میں پڑے ہو؟

"کچھ نہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ اور ہم موٹر میں بیٹھ کر گھر آگئے۔

شام کا کھانا کھا کر دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ سفر کی باتیں اور سری نگر کی باتیں۔ سن مرگ اور پہلگام کے مناظر، کسٹم والوں کی بے ضابطگیاں۔ زعفران کے کھیت اور ڈرائیور کی بدمستیاں۔ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے بھائی صاحب آنکھیں جھپکنے لگے۔ سفر سے تھکے ہوئے تھے۔ میں بھی اٹھ کر خواب گاہ میں چلا آیا۔

خواب گاہ کے اندر رحمان بستر جھاڑ رہا تھا۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر ایک لمحہ کیلئے رکا۔ پھر بستر جھاڑتے ہوئے کہنے لگا۔

"لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُسے آپ سے محبت ہوگئی تھی۔ اس کی نگاہیں ہمیشہ ہوس بوٹ کی چھت پر کسی کو ڈھونڈا کرتیں۔ اور پھر وہ اسی طرح تکتے تکتے بے اختیار ہو کر رونے لگتی۔"

میرے دل پر ایک تیر سا لگا۔ آہ! وہ مجھ سے محبت کرتی تھی ...... ایک دوشیزہ کی پہلی والہانہ محبت۔

"اس کے ماں باپ نے اُسے بہت سمجھایا بجھایا اور آخر تنگ آ کر اس کی شادی کر دی۔"

"ارے۔" میں نے چونک کر کہا۔

"شادی سے ایک روز پہلے وہ میرے پاس آئی۔" رحمن نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وہی نیلا ریشمی چغہ پہنے ہوئے تھی۔ وہ نہایت مطمئن معلوم ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رو رو کر اس کی آنکھوں کے چشمے سوکھ گئے ہیں۔ اور چلّا چلّا کر اس کے گلے میں آواز کی قوت باقی نہیں رہی۔ "وہ کدھر گئے ہیں۔" اس نے کھوکھلی سی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"وہ گھر واپس چلے گئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

اس پر وہ چیخی نہ چلّائی۔ گردن جھکا کے چپ چاپ دیر تک کھڑی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی۔ "وہ کب آئیں گے؟"

مجھے اس پر رحم آرہا تھا۔ ریشمی چغہ پہنے ہوئے بھی وہ کس قدر غریب معلوم ہو رہی تھی۔ غریب اور بے کس، کتنی بے چارگی اس کے لہجے میں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنی اس چھوٹی سی عمر میں مصائب و آلام کے سوا اور کچھ دیکھا ہی نہیں۔ وہ گردن جھکائے کھڑی تھی۔ اور میرے جواب کی منتظر تھی۔ اس کے پھول سے رخسار جو کبھی سیب کی طرح سرخ تھے۔ آج برف کے گالوں کی طرح سفید ہو گئے تھے۔ بس موم کی گڑیا معلوم ہوتی تھی۔ کاش میں اسے تسلی دے سکتا۔ کاش یہ میرے بس میں ہوتا۔ کہ میں اس کی آس بندھا سکتا۔ اور اس کے زرد زرد چہرے پر مسرت کی لہریں دوڑا سکتا!

یہ کہہ کر رحمٰن کچھ دیر چپ ہو رہا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"دوسرے روز اس کی شادی ہو گئی۔ شادی کے تیسرے روز وہ اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی۔ اس نے زہر کھا لیا تھا۔"

فیروز خاموش ہو گیا۔ ہمارا شکارا ڈل میں داخل ہو چکا تھا۔ ہانجیوں کے چپوؤں کی رفتار سست پڑ گئی تھی۔ وہ نہایت نرم اور پُرسوز لے میں چپوؤں کی آواز کی تال پر گا رہے تھے۔

"میرے پیارے آ تیرے باغ میں بہار آئی ہوئی ہے۔"

میرے پریتم آ - آ کہ تیرے درخت پھلوں سے لدے پڑے ہیں
میرے پیارے آ کہ پھولوں کی بہار کا زمانہ میں نے کاہشِ انتظار میں گزار دیا۔

میرے پریتم جلد آ، کہیں اس بہار کو خزاں کا دیو نہ چپٹ کر جائے۔

"اور بس میری کہانی بھی یہاں ختم ہوتی ہے۔" فیروز نے آہستہ سے کہا۔ اس کے لبوں پر ایک یاس انگیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ کشتی کے پہلو پر جھک گیا۔ اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ وہ دیکھتے ہو نا۔ وہ جو ڈل کے اس طرف چنار کے درخت ہیں۔ وہاں اس کنج میں سرسبز گھاس کے نیچے میری فرزی محوِ خواب ہے۔ غروبِ آفتاب کے بعد وہاں چلوگے ارشد بھائی۔"

دور بہت دور ایک مانجی اپنی کشتی کو کنارے پر لگا رہا تھا۔ گانے کی آواز نے شاید اسے بھی متاثر کر دیا تھا۔ فضا کی خاموشیوں کو چیرتی ہوئی۔ پانی کی لہروں سے ٹکراتی ہوئی۔ اس کی سریلی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"آہ میرے پریتم! تیرے باغ میں بہار آئی اور چلی

بھی گئی۔

آہ۔ میرے پیارے! تیرے درختوں پر پھول کھلے اور مرجھا بھی گئے۔

آہ۔ میرے پریتم! درختوں کے پتے تیرے انتظار میں زرد ہو گئے۔ اور ان پر برف ایک سفید دیو کی طرح چھا رہی ہے۔

آہ۔ میرے پیارے! تو نے اپنے خزانے کو یوں لٹتا ہوا چھوڑ کر پردیس کیوں جا بسا؟

میں نے اس کا ہاتھ زور سے دبا دیا۔ میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ ہم دونوں پردہ اٹھا کر باہر دیکھنے لگے۔

ڈل کی نیلی نیلی لہروں پر آفتاب کی آخری کرنیں لرزاں تھیں۔ ہوا میں پھولوں کی بُو بسی ہوئی تھی۔ ہمارے ارد گرد کنول کے پھول تیر رہے تھے۔ اور ان کی نازک پتیوں پر پانی کے قطرے ٹکے ہوئے تھے۔ کسی کی پلکوں پر آنسوؤں کی طرح اور شفق کی ارغوانی روشنی میں چمک رہے تھے۔ کسی کے گلے میں سرخ منکوں کی طرح۔

ویکسی نیٹر

جب میں ایف۔ اے میں فیل ہو کر اس گاؤں میں ویکسی نیٹر
بن کر آیا تو وہ چیز جس کی کشش نے مجھے سب سے زیادہ اپنی طرف
متوجہ کیا ریشماں تھی۔ ریشماں کے حسن وجمال کا چرچا تو میں اس
سے پہلے بھی بہتوں سے سن چکا تھا۔ اور خاص کر راستے میں ایک
پولیس سارجنٹ نے جب اُسے معلوم ہوا کہ میں پنڈور کے گاؤں
میں ویکسی نیٹر بن کر جا رہا ہوں مجھے بتایا کہ "پنڈور کی دلکش وادی
میں یوں تو بہت سی چیزیں اور جگہیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ لکشمن جی
کا کنڈ جس کی گہرائی کا پتہ آج تک کوئی انگریز بھی نہیں لگا سکا۔
جاگیردار صاحب کا پرانا محل جس کے چوکور برج دھوپ میں سونے
کی طرح چمکتے ہیں اور جو آج کل ویران پڑا ہے۔ اور صرف اُسی

وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ جب جاگیر دار صاحب یا ان کے مہمان یا لڑکے بالے کبھی پنڈور کی وادی میں شکار کھیلنے کی غرض سے تشریف لاتے ہیں۔ کھٹے اناروں کا جنگل، جو پنڈور کے مغربی پہاڑیوں پر پھیلا ہوا ہے اور جہاں جنگلی ٹمنگ سیب آلوچے بہی اور املوک کے درخت بھی پائے جاتے ہیں۔ جہاں جنگلی گلاب کی بیلیں کسی محبوب کی باہوں کیطرح ان پھلدار درختوں سے ہر وقت لپٹی رہتی ہیں۔ اور جن کی آغوش میں بنفشے کے پھول ہر لحظہ مسکراتے اور شرماتے ہیں۔

ہاں پنڈور کی وادی میں بہت سی چیزیں دیکھنے کے لائق ہیں لیکن وہاں اگر تم نے ریشماں کو نہ دیکھا تو سمجھ لینا کہ تم نے پنڈور میں کچھ نہیں دیکھا۔"

"سچ مچ۔" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"خدا کی قسم" ——————— ! پولیس سارجنٹ نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔

اگرچہ مجھے یقین تو اب بھی نہ ہوا۔ لیکن ریشماں کو دیکھنے کا شوق دل میں گھر کر گیا۔ آخر وہ بھی ایسی کیا حسین پری ہوگی ؟ ان پولیس والوں کی باتوں پر اعتبار کم ہی کرنا چاہیئے۔ اور پھر عورتوں کے متعلق تو ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر عورت حسین ہوتی ہے۔ چاہے وہ مٹی

ہی کی کیوں نہ ہو۔

اب تو میری حالت اس بوڑھے مرغ کی سی ہے جو شباب گزر جانے پر بھی اپنے آپ کو جوان ہی سمجھتا ہے۔ لیکن ان دنوں جب میں نیا نیا ویکسی نیٹر بن کر یہاں آیا تھا تو میری شکل و شباہت بہت سے لوگوں کیلئے قابلِ رشک تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان دنوں گاؤں بھر میں میں ہی اپنے ڈھنگ کا ایک سجیلا جوان تھا۔ اور پھر انٹرنس پاس اور سفید لٹھے کی شلواریں پہننے والا، گیارہ روپے تنخواہ تھی۔ کلاہ پر طرے دار لنگی، پاؤں میں کام دار جوتی اور چہرے پر مونچھیں سائیکل کے ہینڈل کی طرح مڑی ہوئی۔ ہاں وہ زمانہ تھا میرے بانکپن کا، اب تو جوانی کی بہاریں خزاں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔

آہ، دوست وہ بھی کیا دن تھے۔ کاش تم نے مجھے جوانی میں دیکھا ہوتا۔ دیوانِ غالب میں ایک شعر مجھے بہت پسند ہے، وہ ہے، وہ ہے۔۔۔۔۔۔ آہ اس وقت کم بخت یاد نہیں آ رہا دماغ چکرا رہا ہے لیکن ——— اچھا۔

ہاں، تو میں ریشماں کے متعلق کہہ رہا تھا لیکن میں ریشماں کے متعلق کیا کہوں۔

ریشماں کی آنکھیں، ان نیلی پتلیوں کی اتھاہ گہرائیاں، وہ آنکھیں

ان دو پاک وصاف جھیلوں کی مانند تھیں جو کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہوں، جہاں کسی انسان کے قدم بھی نہ پہنچے ہوں، ریشماں کے نازک لب، شرمسار محجوب سے لب، جیسے وہ اپنی خوبصورتی پر خود ہی پشیمان ہوں۔ اس کے نازک ہاتھ، مرمریں انگلیوں کی پوریں، جنگلی گلاب کی کلیوں کیطرح حسین۔ اس کی چال جیسے دوشیزۂ بہار اپنی تمامتر لطافتوں اور رعنائیوں کو لئے ہوا کے دوش پر اٹھلاتی ہوئی آگئی ہو۔ اس کی آواز صنوبر کے جنگلوں میں گھومتے ہوئے گڈریے کی بنسری کی طرح میٹھی اور اُبلتے ہوئے ٹھنڈے چشموں کے ترنم کی طرح لوچدار، اس کا قد، فارسی کا ایک شعر ہے۔ ایک نہایت ہی موزوں شعر ہے لیکن ..... کم بخت یاد نہیں آرہا، بالکل زبان پر پھر رہا ہے۔ آہ کیا خوب شعر تھا، نظیری کا شعر، نہیں عرفی کا، آہ اب حافظہ کس قدر کمزور ہو گیا ہے۔ کچھ یاد نہیں رہتا ——— کچھ یاد نہیں رہتا۔ مجھے اب تو اپنا کلام بھی یاد نہیں، حیرت ہے، ان دنوں میرا حافظہ کس قدر تیز تھا۔

تو یہ تھی ریشماں، پنڈورہ کی وادی کی حسینہ، بیشک ایک نایاب چیز تھی۔ اور لوگ دور دور سے اُسے دیکھنے کیلئے آیا کرتے تھے اس کے باپ کو ہر روز ریشماں کے ناطے کیلئے پیغام آیا کرتے۔ کوئی پانچسو روپے، کوئی ایک ہزار، کوئی ڈیڑھ ہزار اور کوئی من چلا تین ہزار روپے

تک دینے کو تیار تھا۔ لیکن اس کا باپ شاید صرف نفی میں ہی جواب دینا جانتا تھا۔ کم از کم میں نے تو اُسے کسی سے ہامی بھرتے نہیں دیکھا نہ سنا۔ خدا جانے اس کے دل میں کیا تھا۔ شاید وہ اپنی لڑکی کو کسی بادشاہ کے ہاں دینا چاہتا تھا۔ اور یوں بھی تو ریشماں کسی بادشاہ کے گھر کے ہی لائق تھی۔

لیکن، جیسا کہ میں نے کہا، جوانی بری بلا ہے اور جوانی کی محبت اس سے بھی زیادہ خطرناک، میں نے ریشماں کو دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ دنیا میں ریشماں صرف میرے لئے ہے اور میں اس کے لئے۔ اور یہ ٹھان لی۔ کہ چاہے اس کے باپ کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اِسے اغوا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ لیکن اگر شادی ہوگی تو صرف ریشماں سے، نہیں تو جان پر کھیل جاؤں گا، اس کے سارے خاندان کو تہ تیغ کر دوں گا۔ سارے گاؤں کو آگ لگا دوں گا۔ اس کے سامنے پہاڑی پر سے نیچے نالے میں کود کر مر جاؤں گا، لیکن یہ کبھی گوارا نہ ہو گا کہ میرے جیتے جی میری ریشماں کو کوئی اور شخص چاہے وہ جاگیر دار کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ بیاہ کر لے جائے۔ جوانی میں آدمی کیسی کیسی عجیب باتیں کرتا ہے۔ بیوقوفوں کی سی باتیں — فضول خطرناک، عاقبت نااندیشیاں۔

تو صاحب! میں نے ریشماں کی محبت میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ لوگوں کو ٹیکہ دیکھ لگانا کیسا؟ ہر وقت ریشماں کے پیچھے پیچھے

پھرنے لگا، پاگل کتے کیطرح، وہ چشمے پر پانی بھرنے جاتی۔ تو مجھے پہلے ہی موجود پاتی۔ چرواہوں کے ساتھ جنگل جاتی تو میں بھی اپنی توڑے دار بندوق لئے ہوئے جنگل میں آموجود ہوتا۔ میں ان دنوں گانا بھی اچھا جانتا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ میں ماہیا بہت مزے سے گایا کرتا تھا اور اکثر لوگ میرے ماہیا گانے پر بہت خوش ہوتے تھے۔ کہتے تھے کہ کوئی مراثی بھی اتنا اچھا ماہیا نہیں گا سکتا۔ لیکن اب وہ دن کہاں، اب تو دن میں مجھے دس بار کھانسی کی شکایت ہوتی ہے۔ تم شہر میں رہتے ہو۔ کبھی کوئی اچھی سی دوا ہی بھیج دیا کرو۔ ورنہ تمہارے شہر میں رہنے سہنے کا ہمیں کیا فائدہ کیوں؟

خیر...... ایک دن کی بات ہے میں کسی قریب کے موضع سے چیچک کے ٹیکے لگا کر واپس آ رہا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ اور مغرب سے ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ میں بہت مغموم تھا۔ کیونکہ دن بھر میں گاؤں سے باہر رہنے کیوجہ سے ریشماں کے دیدار سے محروم رہا تھا چنانچہ بہت ہی حزیں لہجہ میں آہستہ آہستہ ع

"فراقِ جاناں میں ہم نے ساقی لہو پیا ہے شراب کر کے"

گاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ میں اس وقت بہت اداس تھا۔ میری آنکھیں شاید اس وقت آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ اور مجھے اپنے آپ پر بہت خیال آ رہا تھا۔ گاؤں کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے راستے میں

ایک خوبانی کا درخت آتا ہے۔ چنانچہ جب میں اس خوبانی کے درخت کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ تنے کا سہارا لئے اپنی سنہری کاکلوں کو اپنے نازک شانوں پر پریشان کئے ریشماں کھڑی میری راہ تک رہی ہے۔ میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

چند لمحے چند صدیوں کی طرح گزرے۔ پھر ریشماں بولی اپنی نرم میٹھی آواز میں۔ "جی آپ مجھے کیوں تنگ کرتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "اس لئے کہ میں تمھیں چاہتا ہوں، اور تمھیں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

ریشماں بولی، "جی، مجھے سب سہیلیاں طعنے دیتی ہیں۔" اور پھر اسی طرح آپ کا میرے پیچھے پھرنا ٹھیک نہیں، میں آپ کو گالیاں دوں گی، تو پھر آپ ......"

میں نے کہا۔ "تو میں نے کب منع کیا ہے آپ شوق سے گالیاں دیں۔ میں انھیں سنتا جاؤں گا۔ اور پھر انھیں اکٹھا کر لوں گا۔ پھولوں کی طرح پھر ان کا ہار بنا کر اپنے گلے میں پہن لوں گا۔"

ریشماں بولی۔ "ہم ٹھہریں اَن پڑھ۔ بھلا ہمیں آپ کی طرح باتیں بنانا کہاں سے آئیں۔ لیکن میں آپ سے پھر کہتی ہوں، خدا کے لئے آپ میرا پیچھا کرنا چھوڑ دیں۔ ابا آپ کی جان کے لاگو ہو رہے ہیں کہتے

تھے۔ اگر وہ لڑکا باز نہ آیا تو اُسے قتل کر ڈالیں گے۔"

میں نے سر جھکا کر کہا۔ "یہ سر حاضر ہے۔ ابھی گردن اُڑا دیجئے اگر اُف کر جاؤں تو......."

ریشماں نے ایک عجب ادا سے سر ہلا کر کہا۔ "ہائے میں یہ کب کہتی ہوں کہ آپ مر جائیں، لیکن آخر...... آپ چاہتے کیا ہیں۔؟"

"میں کچھ نہیں چاہتا۔" میں نے اپنا ہاتھ اپنے کلیجے پر رکھ کر کہا۔ "ہاں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب تم یہاں سے چلی جاؤ تو تمھارے پیارے قدموں کی خاک اپنے ماتھے سے لگالوں اور تمھارا نام لیتا ہوا اسی دم اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔"

ریشماں مسکرائی، ایک لڑکی کیطرح نہیں، بلکہ ایک عورت کی طرح مسکرائی۔ اس نے پلکیں اٹھا کر ایک لمحہ کیلئے مجھے دیکھا۔ پھر وہ پلکیں گلاب کے پھولوں کی طرح خوشنما اور نازک گالوں پر جھک گئیں۔ دوسرے لمحہ ہنستے ہوئے وہ وہاں سے بھاگ گئی۔ بھاگتی جاتی تھی اور مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتی جاتی تھی۔

چند لمحے تو میں چپ چاپ پتھر کے بت کی طرح ساکن کھڑا رہا۔ پھر میں نے بھی ریشماں کے پیچھے تیزی سے بھاگنا شروع

کردیا۔ وہ ایک ہرنی کیطرح تیز بھاگ رہی تھی. اس کے منہ سے ہنسی کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں، آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر ہم دونوں کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا.

اب میں اس کے بالکل قریب آگیا تھا۔لیکن ابھی اُسے چھو نہیں سکتا تھا.

وہ اب زیادہ تیزی سے بھاگنے لگی.

لیکن میں اب اور بھی قریب آگیا تھا اور ہمارے درمیان بالکل تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تھا.

" دیکھو، ہمیں ...... ہمارا پیچھا مت کرو ..... میں کہتی ہوں یہ اچھا نہیں ......"

ایک چھلانگ لگا کر میں نے اُسے جا دبوچا اور آغوش میں اٹھا لیا۔ " اب کدھر جاؤ گی ؟"

" مجھے چھوڑ دو ...... مجھے چھوڑ دو .... میں گھر جاؤنگی" اس نے کمزور سی آواز میں کہا.

میں ایک چنار کے درخت کے قریب جا کر رُک گیا. اور اُسے سبز روش پر آہستہ سے گرا دیا۔ اور پھر اس کے قریب ہی سستانے کیلئے بیٹھ گیا.

"دیکھا تم نے ؟" تم مجھ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتیں۔"
میں نے ہنس کر کہا۔
وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اور اپنے پریشان بال درست کرتی رہی۔

ہم گاؤں سے بہت دور نکل آئے تھے۔ شفق گم ہو چکی تھی لیکن پھر بھی ندی کا پانی ایک چاندی کے تار کی طرح چمک رہا تھا۔ ہاں پہاڑوں پر اب جنگل دکھائی نہ دیتے تھے۔ اندھیرے کی سیاہی میں غائب ہو چکے تھے۔ کہیں کہیں تارے بھی نکل آئے تھے
میں نے ریشماں سے پوچھا۔ "تم مجھ سے کب نکاح کرو گی۔؟"

"کبھی نہیں!"

"وہ کیوں؟"

"تم تیلی ہو۔ ہم مغل ہیں۔" ریشماں نے شوخی سے کہا۔

"اس سے کیا ہوتا ہے؟" میں نے ریشماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "کیا تمھیں مجھ سے محبت نہیں؟"

"ہرگز نہیں!"

"تو پھر تم میرے پاس کیوں بیٹھی ہو؟"

جواب میں ریشماں نے میری طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ پھر یکایک کسی خیال کے زیر اثر وہ کانپ اٹھی۔ اور آہستہ سے کہنے لگی۔

"میں آج خوب پٹوں گی۔ ابا مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے لیکن یہ کہہ تو آئی تھی۔ کہ میں خالہ کے ہاں جا رہی ہوں لیکن اب دیر بھی تو بہت ......"

میں نے قطع کلام کر کے کہا۔ "تم ایسی شریر لڑکی اسی لائق ہے کہ اسے خوب پیٹا جائے۔"

ریشماں بولی۔ "میں جانتی ہوں۔ تم مجھے کبھی نہیں پیٹو گے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں، کیونکہ میں ایک تیلی ہوں اور تم مغل زادی ہو۔"

ریشماں نے اپنا نازک ہاتھ میرے کندھے سے لگایا۔ پھر بے اختیار اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

"تم کتنے ناشکرے ہو۔" اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔

اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یکایک آسمان کے ستارے کھلکھلا کر ہنس پڑے ہیں اور چاند کی روشنی میں سفید سفید بادلوں کے کانپتے ہوئے نازک سائے کسی نامعلوم خوشی کے زیرِ اثر ناچنے لگے ہیں اور

مغربی ہوا کے جھونکے چنار کے پتوں میں چھپ چھپ کر غیر فانی زندگی کے گیت گا رہے ہیں۔ میں نے ریشماں کی لمبی لمبی زلفوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے محسوس کیا۔ کہ یہ خوشی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوگی۔ اور جب میں نے وفورِ شوق سے بے اختیار ہو کر اپنے لب اس کے لبوں پر رکھ دیئے۔ تو مجھے معلوم ہوا کہ ان ہونٹوں میں پہاڑی شہد کی سی مٹھاس ہے اور دہکتے ہوئے انگاروں کی سی گرمی اور جلن دونوں ہی احساس تھے۔ ایک تکلیف دہ خوشی اور ایک جاں بخش اذیت۔

اس کے بعد آٹھ دس دنوں کے کوائف میں تمہیں اچھی طرح نہیں بتا سکتا۔ کچھ یاد نہیں آتا۔ زندگی ایک دل خوش کُن خواب کی طرح گزر رہی تھی۔ جس میں مَیں اور ریشماں ہی تھے۔ کچھ عجیب سی حالت تھی۔ شراب کا سا نشہ، دلفریب نغموں کا سا سرور، سارا گاؤں جنت نظر آتا تھا۔ اور دور سے جاگیر دار صاحب کے پرانے محل کے برج سونے کے کلسوں کی طرح چمکتے تھے۔ عجیب اور پُر اسرار، مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ یہ تمام دنیا، قدرت کی رعنائیاں، پرندوں کے چہچے بے فکر گڈریوں کے قہقہے ہمارے لئے ہی پیدا کئے گئے ہیں میرے اور ریشماں کیلئے تاکہ شام کے جھٹپٹے میں ہم دونوں چھپ کر اور باہوں میں باہیں ڈال کر گاؤں سے باہر کسی ننھے سے مرغزار میں جا بیٹھیں

اور ان نظاروں سے لطف اندوز ہوں۔

لیکن یہ سب کچھ آٹھ دس دن کے لئے تھا۔ اس کے بعد ایک ظالم وحشی ہاتھ نے ایک پُرزور جھٹکے کے ساتھ میرے دلفریب خواب کو منتشر کر دیا۔

عین اس دن جب ہم دونوں نے گاؤں سے بھاگ جانے کی صلاح کی تھی۔ ریشماں کے ظالم باپ نے اُسے جاگیر دار صاحب کے بڑے لڑکے کے حوالے کر دیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ بہت دیر سے در پردہ مشورے ہو رہے تھے۔

جاگیر دار صاحب کا بڑا لڑکا بہت اوباش ہے۔ جس طرح بڑے آدمیوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ وہ ریشماں پر لٹو تھا۔ کہیں شکار کھیلتے آتے جاتے دیکھ لیا ہو گا۔ بس ریشماں کے باپ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ اِدھر میری بے خبری کا یہ عالم کہ مجھے اس وقت پتہ چلا کہ جب ریشماں شہر میں جاگیر دار صاحب کے محل میں پہنچائی جا چکی تھی۔

یہ چوٹ اتنی کاری اور ناگہانی تھی کہ میں اپنے حواس برقرار نہ رکھ سکا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد دو سال تک میں پاگل سا رہا۔ سوکھ کر بالکل کانٹا ہو گیا تھا۔ در بدر گھومتا تھا اور لوگوں سے

کہتا تھا" مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ وہ مجھے کاٹنے کو آ رہی ہے۔" بس یہی دو کلمات تھے جو ہر وقت میری زبان پر جاری رہتے۔

سنا ہے کہ ایک دن جب میں جاگیردار صاحب کے شہر میں گھوم رہا تھا۔ انھوں نے مجھے کہیں دیکھ لیا۔ اور جب کسی مصاحب سے انھوں نے میری رام کہانی سنی تو مجھ پر بہت ترس کیا۔ اور علاج کیلئے شکارپور کے پاگل خانے میں بھیج دیا۔ اور جب میں دو سال کے بعد تندرست ہو گیا تو پھر مجھے اپنے پرانے عہدے پر اسی وادی میں تعینات کر دیا۔ لیکن اس گاؤں میں نہیں بلکہ دور کے گاؤں میں جو یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔"

اتنا کہہ کر وکیسی نیٹر چپ ہو گیا اور حقّہ گڑگڑانے لگا۔ رشید نے آہستہ سے پوچھا۔

"اور ریشماں؟ ...... تم نے اُسے پھر کبھی دیکھا؟"

"ریشماں جاگیردار صاحب کے بڑے لڑکے کے حرم میں ہے۔ اگرچہ وہاں عورتیں تو بہت ہیں۔ لیکن ریشماں کو اپنے مالک کی چہیتی ہونے کا فخر ضرور حاصل ہے۔ اس کے دو لڑکے بھی ہیں .... میں نے اسے آٹھ نو سال ہوئے اس کے باپ کے گھر اسی گاؤں میں دیکھا تھا۔ جب وہ اپنے بھائی کی شادی پر یہاں آئی تھی۔ اس کا باپ

اب کیا یہ بھی بتلانے کی ضرورت ہے کہ اس گاؤں کا نمبردار ہے۔ اور علاقے کا ذیلدار۔ اس کا مکان پتھروں سے بنا ہے۔ تم نے راستے میں دیکھا تو ہوگا۔ وہ جس پر ٹین کی چھت ہے اور جس کے عقب میں ایک بڑا سا باغیچہ ہے..... میں نے اسے اس باغیچہ میں دیکھا تھا۔ وہ خوبصورت ریشمیں لباس پہنے ٹہل رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس کے دونوں چھوٹے لڑکے تھے۔ وہ اب بھی بے حد خوب صورت تھی۔ اس کی چال شہزادیوں جیسی تھی۔ میں دیر تک باڑ کی اوٹ میں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔

ریشماں جو کبھی میری منکوحہ ہوتی۔ ریشمیں کپڑوں کی بجائے وہ سرخ سوسی کی بھاری شلوار اور چھینٹ کی قمیص پہن کر میرے اپنے بچوں کو لے کر یوں ٹہلا کرتی۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ اور انھیں پونچھنے کی کوشش کئے بغیر ہی میں باڑ کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ اور اُسے گالیاں دینے لگا۔ میں نے اُسے سخت فحش کلمات کہے۔ اس کے ماں باپ کو گالیاں دیں۔ اُس کے سارے خاندان کو جی بھر کر اور چیخ چیخ کر کوسا اور اس وقت تک وہاں سے نہ ٹلا۔ جب تک لوگ مجھے وہاں سے کھینچ کر اور گھسیٹ کر پرے نہ لے گئے۔"

" اور ریشماں نے تمہیں کچھ نہ کہا۔" رشید نے پوچھا
" نہیں، مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے گردن جھکالی۔ اور چپ چاپ گالیاں سنتی رہی۔ اس کی آنکھوں کی نیلی جھیلوں سے آنسوؤں کے چشمے بہ نکلے اور اس نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے اپنے دونوں لڑکوں کو اپنے ساتھ چمٹا لیا ...... بعد میں جب وہ اپنے گاؤں سے چلی گئی تو اس کی ایک پرانی سہیلی نے مجھے بتایا کہ اس سوال پر کہ تم نے وہاں باغیچہ میں کھڑی رہ کر اس کی گالیاں کیوں سنیں؟" ریشماں نے جواب دیا " اس وقت وہ اگر مجھے پیٹ ڈالتا یا جان سے مار ڈالتا تو بھی میں وہاں سے نہ ہلتی.... پھر اس نے کہا۔ اے میری جان سہیلی، وہ گالیاں نہ تھیں پھول تھے۔ میرے محبوب کے جنہیں میں نے چن چن کر اپنے آنسوؤں کے تار میں پرو لیا۔ اور اپنے دل کے مزار پر چڑھا دیا۔ تاکہ محبت کی قبر سونی نہ رہنے...
لیکن وکیسی نیٹر نے غمناک آواز میں داستان ختم کرتے ہوئے کہا۔
" مجھے اب کسی پر غصہ نہیں، کسی سے محبت نہیں۔ میں اب کسی کا لحاظ نہیں رکھتا۔ پہلے چیچک کے ٹیکے مفت لگاتا تھا۔

اب دو آنے سائے بغیر کسی کے بازو کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ میں اب اپنا روپیہ ڈیوڑھی فیس پر قرض دیتا ہوں، اس گاؤں میں سوائے ریشماں کے باپ کے، سب میرے قرض دار ہیں وہ مجھے کنجوس اور ظالم کہتے ہیں لیکن انھوں نے کب میرا بھلا چاہا۔ ان کا بس چلے تو مجھے آج قتل کر دیں۔ لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں میرے پاس روپیہ ہے زمین ہے بال بچے ہیں تین نکاح کر چکا ہوں مجھے کسی کی پروا نہیں کسی سے محبت نہیں، کسی پر غصہ نہیں۔ میں جاگیر دار صاحب کی وفادار رعایا ہوں۔ ان کا غلام نہیں۔

"کیا سچ مچ تمھیں کسی پر غصہ نہیں آتا ؟" رشید نے تیز نگاہوں سے ویکسی نیٹر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

ویکسی نیٹر گھبرا سا گیا۔ آنکھیں نیچی کر کے بولا۔ "نہیں ہرگز نہیں۔ میرا دل صاف ہے . . لیکن دوست . . . ." اب ویکسی نیٹر نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھالیں اور رشید کی طرف محجوب نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا . . . .

"میں ایک بات تم سے کہنا چاہتا ہوں اور اسے کہتے وقت میرا سینہ پھٹا جاتا ہے اور میں یہ بات تم سے کہے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ بات جاگیر دار صاحب کے اس پرانے محل کے برجوں کے

متعلق ہے . . . . میں انھیں دھوپ میں سونے کی طرح چمکتے ہوئے دیکھ کر بارہا پاگل ہو جاتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ میرا منہ چڑا رہے ہیں۔ میں انھیں صاف صاف کہتے سنتا ہوں" تم ہمیں نہیں جانتے۔ ہم اب بھی تمہاری دنیاؤں کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ تمھارے امن و سکون کو خس و خاشاک میں ملا سکتے ہیں۔ تمھاری زندگی کی خوشیوں کو پاؤں تلے روند سکتے ہیں تم ہمیں نہیں پہچانتے ہا ہا ہا۔"

اور میں پاگل ہو جاتا ہوں اور سوچتا ہوں، کہ جب تک یہ چمکتے ہوئے برج موجود ہیں میرے دل کو اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا بارہا میرے دل میں خیال آتا ہے کہ ایک دو پیسے کا بارود لے کر میں رات کے وقت اس پرانے محل کے قریب جاؤں اور بارود لگا کر بھک سے ان برجوں کو اُڑا دوں تو . . . . تو . . . لیکن میں نے ہر بار اس موذی خیال کو دل میں زور سے دبا دیا ہے۔"

اور ویٹر نے رازدارانہ لہجہ میں رشید کیطرف جھک کر کہا۔

"لیکن ایک دن میں اس کام کو ضرور پورا کر کے چھوڑونگا . . . ."

ختم

خونی ناچ

دوسرے دن عید تھی اور میں پانچ دن کی رخصت لے کر
گھر جا رہا تھا۔ ایک ٹرنک اور ایک گٹھڑی جس میں گوجرانوالے کے
سرخ مالٹے اور کچھ بچوں کیلئے کھلونے بندھے تھے۔ بس یہ مختصر سا
سامان تھا۔ جسے میں نے اترتے ہی کرایہ کے سالم تانگے پر لدوا لیا۔
اور خوشی خوشی گھر چلا۔ کل عید بھی تھی اور پھر خالہ اور خالہ کی لڑکی رفعت
بھی آئی ہوگی۔ رفعت کی بڑی بڑی آنکھوں کی ملائمت اور اس کے
محجوب سے لبوں کی مسکراہٹ بار بار گویا آنکھوں کے آگے آ کر کہہ
رہی تھی۔ "اوہ بھائی جان — آپ بھی آ گئے — اب شو دھنا کا
خونی ناچ دیکھنے میں خوب لطف آئے گا۔"
جب سے میں نے گوجرانوالہ میں شو دھنا کے رقص کے

متعلق اخبار میں مضامین پڑھے تھے۔ بس یہی سوچ رہا تھا کہ عید ہوگی اور رفعت اور میں اور شو دھنا کا خونی ناچ۔ رفعت، رفعت، کتنا خوبصورت نام ہے۔ اور مردانہ نام ہو تو عارف، عتیق، محبوب، کچھ ہو لیکن صابر، صابر —— یہ نام تو ایسا ہے جیسا کسی چمڑا بیچنے والے دکاندار کا۔

یکایک میونسپلٹی کی سڑک کے ایک گڑھے نے تانگے کو وہ ہچکولا دیا کہ گھوڑا گرتے گرتے بچا۔ اور مجھے تو گویا دن میں تارے نظر آ گئے۔ اب تانگے والے کے منہ سے ایسی نئی "بطرز جدید" قسم کی گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی کہ میں رشک و حیرت سے اس کے منہ کی طرف تکتا رہ گیا۔ میں نے سوچا کیا روانی ہے۔ زبان میں کسقدر لوچ ہے کیسی لچھے دار تشبیہیں، کاش یہ تانگے والا ادیب ہوتا۔

شاہ عالمی سے لیکر لوہاری دروازے تک میونسپل باغ کے لکڑی کے جنگلے پر پرانے گرم کوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ اور ہر دس قدم کے فاصلے پر دو تین کابلی پٹھان فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ لیکن وہ اس وقت گرم کوٹ نہیں بیچ رہے تھے بلکہ تانگے والے کے منہ سے لاہور میونسپلٹی کے متعلق تعریفی کلمات اور شاعرانہ مبالغہ آرائیاں سن سن کر حیران ہو رہے تھے۔ ستیلا کے مندر کے قریب تانگے والے کو ذرا رک جانا پڑا۔ یہاں بہت بھیڑ تھی۔ بہت

سے لوگ جمع تھے اور دو چار پولیس کے جوان بھی۔ ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ شرط بد کر بھاگنے والے دو تانگے آپس میں ٹکرا گئے تھے اور ایک مزدور جو بستر اُٹھائے ہوئے آگے دوڑا جا رہا تھا۔ ان دو تانگوں کے بیچ میں آکر بُری طرح کچلا گیا تھا۔ اس کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش سڑک پر پڑی تھی۔ اور بستر کا مالک اپنی دھوتی سنبھالتے ہوئے تانگے والوں کی بدمعاشی کا، گاڑی سے لیٹ ہو جانے کا، اور بستر کے لہو سے لت پت ہو جانے کا بلند اور کرخت آواز میں ذکر کر رہا تھا۔ لمبی لمبی مونچھوں کو سائیکل کے ہینڈل کی طرح موڑ کر رکھنے کا شوقین سپاہی ہنٹر ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا۔ "یہ سب ان تانگے والوں کی بدمعاشی ہے"۔

دوسرا سپاہی بولا۔ "اپنا نام لکھاؤ لالہ جی۔"

مجمع میں مختلف آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔ "اوہو۔ اوہو۔ چ چ، چ، مر گیا بیچارہ"

"گھوڑے بھی زخمی ہو گئے ہیں"

"کم بخت تانگے والوں کو کوئی چوٹ نہیں آئی، مگر دیکھئے اس تانگے والے کا تو کم سے کم سو روپیہ کا نقصان ہو گیا ——"

"اُف ...... !"

تانگے اور موٹریں، لاریاں اور چھکڑے جمع ہو گئے دیکھتے

دیکھتے شاہ عالمی تک راستہ بند ہو گیا۔ آخر مشکل سے میرے تانگے والے نے بڑ کے درخت کے قریب "ہٹو مہربان، لالہ جی ایک طرف، خانصاحب، سنتری جی، سائیں جی، او مائی بچ جا۔" کہہ کر راستہ نکالا اور پھر گھوڑے کو جو چابک دکھایا تو لوہاری کے چوک میں پہنچ گیا۔ خوانچے والے کی صدائیں، انارکلی کے اندر گزرتے ہوئے تانگوں میں دلفریب ساریوں کی جھلک، "یہ لاہور ہے" اور سینما والوں کی اشتہاری گاڑیاں، عید کی خوشی میں خاص پروگرام، ریجنٹ میں "نورِ اسلام" کراؤن میں "بانکی الفت" الفنسٹن میں "شاہی لٹیرا" راکسی میں "شانِ قلندر" پربھات میں شو دھنا کا ناچ۔"

شو دھنا کا ناچ اور رفعت!

بھاٹی دروازہ پہنچ کر میں نے تانگے والے سے کہا "مجھے یہیں اترنا ہے۔"

ایک مزدور نے دوڑ کر میرا اسباب اٹھایا۔ اور فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔ تانگے والے نے چار آنے لیکر گھوڑے کا رخ لوہاری دروازے کی طرف موڑ دیا۔ اور قریب کی ایک دکان سے پان لینے چلا گیا۔

مزدور بولا ۔ " اسباب اُٹھاؤں ؟ جی ؟ "

" اُٹھاؤ ذیلدار روڈ پر لے چلو ، یہاں سے قریب تو ہے ایک آنہ دیں گے ۔ "

کچھ جواب دیئے بغیر ہی نوجوان مزدور نے لبستر اور گٹھڑی اٹھالی اور ساتھ ساتھ چلنے لگا ۔ میں نے یونہی پوچھا ۔

" ذیلدار روڈ کا راستہ جانتے ہو ؟ "

" جی نہیں ، نیا نیا آیا ہوں " اس کا لہجہ نہایت خوشگوار اور دیہاتی تھا ۔ شہری تصنّع سے بالکل پاک ۔

" کہاں سے آئے ہو ؟ "

" ملتان سے ۔ "

" خاص ملتان سے ؟ "

" جی نہیں ملتان کے پاس پاروال گاؤں ہے وہاں سے آیا ہوں ۔ پہلے لائل پور گیا تھا ۔ پھر ادھر لاہور آگیا ہوں ۔ "

" کیا لائلپور میں اچھی مزدوری نہیں ملتی ؟ "

" مزدوری تو ـــــ ملتی تھی مگر . . . . . . بات یہ ہوئی کہ میں اور میرا بڑا بھائی . . . . . ہم چار بھائی ہیں ۔ میرے تین بڑے بھائی بیاہے ہوئے ہیں ۔ مگر میں کنوارا ہوں ۔ دو بڑے

بھائی پاروال میں کاشت کرتے ہیں۔ زمین تھوڑی ہے گزارہ نہیں ہوتا۔ مجھ سے بڑے بھائی کا پچھلے سال بیاہ ہوا ہے۔ ہم دونوں بھائی مزدوری کیلئے ملتان سے لائل پور منڈی آئے تھے اور ایک دن جب ہم گھنٹہ گھر کے قریب سستا رہے تھے۔ ہمیں ایک بابو ملا۔ اس نے کلاہ پر لنگی باندھ رکھی تھی۔ ہم سے پوچھنے لگا۔ "مزدوری کرو گے؟" ہم نے کہا۔ "کریں گے!" بولا یہاں کیا لیتے ہو؟" ہم نے کہا "آٹھ آنے روزانہ" کہنے لگا۔ "میں بارہ آنے روزانہ دوں گا۔ لیکن تمھیں ملک وال میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔"

ہم نے سوچا چلو مزدوری تو اچھی ملتی ہے، ہم ملکوال چلے گئے وہاں سے وہ بابو ہمیں سدھووال لے گیا۔ راستے میں ہمیں تسلی دیتا گیا کہ بڑا آسان کام ہے بس یہی دیواروں پر سفیدی وغیرہ کرنا۔ ہم نے اس سے پہلے سفیدی تو نہ کی تھی۔ لیکن سوچا اس میں کیا ہے کریں گے،

سدھووال جاکر اس نے ہمارے ہاتھوں میں ایک ایک کدال تھما دی۔ اور ریلوے لائن پر لے گیا۔ اور کہا کہ اس کے ساتھ ساتھ یہ زمین کھودنی ہے اور جتنے فٹ زمین روز کھودو گے اس کے

حساب سے تمھیں پیسے ملیں گے۔ اس حساب سے ہمیں بمشکل چار آنے روز ملتے تھے اور زمین کھودتے کھودتے ہمارے ہاتھ اور بازو شل ہو گئے۔ ایسی سخت مٹی تھی وہ، آخر ایک دن، رات کو ہم دونوں بھائی بھاگ نکلے۔ اس سے ہمیں بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ ہمیں دن بھر گالیاں دیتا رہتا تھا۔ اور اکثر پیٹ بھی ڈالتا تھا۔ پھر ہم یہاں آ گئے یہاں ہم صبح کو منڈی جاتے ہیں۔ وہاں بارہ بجے تک چار آنے ہو جاتے ہیں۔ پھر ہم دن بھر ادھر اُدھر گھوم کر مزدوری کرتے رہتے ہیں بہت ہوا تو کسی دن آٹھ نو بن گئے لیکن عام طور پر پانچ چھ آنے سے زیادہ روزانہ کمائی نہیں ہوتی۔"

میں نے پوچھا۔ "تم رات کو رہتے کہاں ہو؟"

"جی داتا کے دربار میں۔"

"وہاں جگہ ہے؟"

"مجاور کی مہربانی سے رات بسر ہو جاتی ہے اور پھر ہم انھیں خوش بھی کر دیتے ہیں۔"

"اچھا؟"

"جی۔"

اب میرا گھر سامنے آ گیا تھا۔ ننھا عبید سامنے مٹی میں کھیل

رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور دیکھتے ہی اپنی توتلی زبان میں چلّا اٹھا۔ "بھائی جان آوئے " اور یہ کہتا ہوا دوڑ کر اندر چلا گیا۔

دالان میں پہنچ کر مزدور نے بستر اور گٹھڑی فرش پر رکھ دی۔ اور ایک طرف ہو کر پسینہ پونچھنے لگا۔ اب گھر کے سب لوگ میرے گرد جمع ہو رہے تھے اور پُر مسرّت نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ننھا عبید اور منجھلا بھائی، امّاں، خالہ اور رفعت، رفعت کی نرم مسکراہٹ اور رفعت کی مہربان نگاہیں۔

منجھلے بھائی بولے۔ "ہم تو صبح کی گاڑی سے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔"

امّاں بولیں۔ "رفیع کی نانی اب تو اچھی ہیں نا؟"

رفعت نے ہنستے ہنستے کہا۔ "بھائی جان ہم تو آج ہی شو دھنا کا ناچ دیکھنے کی تیاری کر رہے ہیں۔"

مزدور کونے میں سے بولا۔ "بجھے پیسے جلد دیجئے، میرا بھائی انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ ابھی ابھی شاہ عالمی تک ایک لالہ کیساتھ بستر اُٹھا کر گیا ہے۔ اور اب واپس آ کر داتا جی کے دربار میں انتظار کر رہا ہوگا۔" پھر مسکرا کر کہنے لگا۔ "کچھ انعام بھی مل جائے۔ کل عید ہے بابو جی۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر یکایک میرا ہاتھ رک گیا میرا سارا جسم کانپنے لگا. میری آنکھوں کے آگے زمین و آسمان گھومنے لگے. رفعت کی مسکراہٹ پھیلتی ہوئی ساری فضا میں عجیب حلقے بناتی ہوئی دکھائی دی.

شودھنا کے رقصاں پاؤں میں بندھے گھنگرو زور زور سے چھنکنے لگے. ساری کائنات لرز رہی تھی۔ انارکلی میں گزرتے ہوئے تانگے دلفریب ساریوں کی بہار دکھاتے ہوئے فضا میں لڑھکنے لگے. اب چاروں طرف خون ہی خون تھا۔ اور دو پتھرائی ہوئی آنکھیں اس میں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ اور کوئی لاکھوں کروڑوں مکھیوں کے بھنبھنانے کی گونج کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ " اے ہے پچ پچ پچ بے چارہ مرگیا ۔

دل کا چراغ

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی، تو چار بجے تھے اور خواب گاہ کی کھڑکی کے سامنے سڑک کے اس پار سکھ دکاندار کی دکان سے سکھ منی جی کے پاٹھ کی آواز آ رہی تھی۔ لہجے سے صدق، عجز اور پاکیزگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن آواز ذرا منجھی ہوئی تھی۔ اس لئے برابر چلی آ رہی تھی۔ ایسی آواز جو اپنی پاکیزگی کے باوجود میرے کانوں کو تیز معلوم ہوئی۔ گویا کہہ رہی تھی۔

"مردود تجھے اپنا خالق کا کچھ پاس نہیں، کیسی میٹھی نیند سو رہا ہے، شرم نہیں آتی تجھے، دیکھ ستارے ماند پڑ رہے ہیں، مشرق سے روشنی پھوٹ رہی ہے اور میں اپنے قادرِ مطلق کی تعریف کا گیت بن کر آسمان کی طرف اٹھ رہی ہوں۔ اٹھ اٹھ بے شرم

کافر، ملحد، دہریے، آواز اونچی ہو رہی تھی۔ تھراتی ہوئی لرزتی ہوئی گویا اپنے آپ کو ربِ عظیم کے آستانے پر نچھاور کرتی ہوئی میری کھڑکی کے اندر چلی آ رہی تھی۔ میں نے نیند سے بھرے ہوئے پپوٹوں کو اٹھائے بغیر ہی کھڑکی کے پردے گرا دیئے۔ کھڑکی بند کر دی اور لحاف منہ اور سر کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر سو گیا۔ لیکن میرے اللہ وہ آواز ابھی تک آ رہی تھی۔ اور اب تو گویا چلا چلا کر کہہ رہی تھی، اُٹھ اُٹھ :

"اُٹھ فریدا ستیا تے من دا دیوا بال۔"

(اے سوئے ہوئے فرید اُٹھ اور دل کا چراغ روشن کر لے)

گو میرا نام فرید نہیں لیکن پھر بھی میں نے اب یہی مناسب سمجھا کہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ جاؤں اور میز پر پڑے ہوئے ٹیبل لیمپ کو روشن کر دوں۔ جب کمرے میں اجالا ہو گیا۔ تو روشنی اور آواز دونوں نے مل کر نیند کا میٹھا تسکین دہ خمار میری آنکھوں سے بالکل دور کر دیا۔ اب مجھے آنکھوں میں ایک جلن اور چبھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ یہ آواز نہ تھی بلکہ سوئیاں اور کانٹے تھے جو میری آنکھوں میں چُبھ رہے تھے۔ میں نے آنکھیں مَلتے ہوئے کھڑکی کھول دی۔ ایک زناٹے دار آواز آئی۔

"اُٹھ فریدا ستیا تے من دا دیوا بال۔"

" صاحب جنھاں دے جاگدے نفراں کی سونے نال۔"

(اور جب تیرا صاحب جاگ رہا ہو تو اے بہرے کے بچے تجھے سونے کا کیا حق ہے)

بالکل درست، پیر و مرشد، بالکل درست، آج کی خطا معاف ہو، کل اگر چار بجے سے پہلے ہی نہ اٹھوں تو پھر ——— بھلا آپ کی آواز ہی مجھے کیوں چین لینے دے گی۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو سامنے سکھ دکاندار کی دکان پر کوئی جھاڑو دے رہا تھا۔ ٹین کے ڈبوں کو جھاڑ کر اپنی جگہ رکھ رہا تھا۔ آٹے اور دال کی بوریوں کو اٹھا اٹھا کر قرینے سے سجا رہا تھا۔ یہ وہ بیچارہ کوتاہ قد زرد رو سکھ دکاندار تو نہ تھا۔ یہ تو کوئی اور تھا۔ شمع کی ہلکی سی لو میں اس کی لمبی پرچھائیں، اس کا چست پائجامہ اور کاندھوں کے گرد لپٹا ہوا کھیس نظر آ رہا تھا۔ یا پھر وہی صدائے برحق۔

"گن گاویں تے من بھاویں" (اپنے گورو کی تعریف کرتا کہ تو اس کے دل میں گھر کر سکے)

جی!

گن گاویں تے من بھاویں

جی!

جی! بالکل درست، پیرومرشد، بالکل درست، اگر میں اپنے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کی دن رات خوشامد نہ کرتا تو آج محض ایک "ایف .اے فیل" ہوکر بہتر روپے تنخواہ نہ پاتا۔

"جی، ست سری اکال!" اب وہ لمبی پرچھائیں دکان کے باہر آگئی تھی جس نعرے نے گورونانک نگر کے در و دیوار ہلا دیئے تھے۔ وہ نعرہ میری کھڑکی کھلی دیکھ کر ہی لگایا گیا تھا۔

"آہا، بابوجی، آج تو آپ "بڑے سویرے" اُٹھ بیٹھے۔" لمبی پرچھائیں نے کہا۔

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"بابوجی، سویرے اٹھنا بہت اچھا ہوتا ہے۔ اب تو خیر بہت اُجالا ہوگیا ہے۔"

میں نے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ گھٹاٹوپ اندھیرا ابھی تو چار ہی بجے تھے۔ ستارے چمک رہے تھے اور بجلی کے کھمبوں پر قمقمے بھی۔ اجالا کہاں ہے۔ میں نے سوچا، پھر خیال آیا۔ کہ یہ معرفت کی باتیں ہیں۔ تو بے وقوف انھیں کیا جانے! جس کے دل میں اجالا ہوتا ہے۔ اُسے ہر طرف اجالا ہی اجالا دکھائی دیتا ہے۔

میں نے پوچھا، "یہ —— دکان کے —— نند سنگھ جی کہاں ہیں۔؟"

"گھر پر ہی ہیں جی، وہ تو ابھی سو رہے ہوں گے جی، میں نے سوچا چلو، ان کے گھر مہمان بن کر آیا ہوں تو کچھ سیوا ہی کر لوں، کر سیوا کھا میوہ۔ میرا نام درشن سنگھ ہے جی، میں نند سنگھ جی کے بڑے سالے کا بڑا لڑکا ہوں، جی، میں نورپور میں گرنتھی ہوں۔ نند سنگھ جی ذرا بیمار رہتے ہیں۔ انھیں مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ آپ کو تو پتہ ہی ہو گا۔ واہگورو مہاراج سب کا بھلا کرے تو —— انھوں نے مجھے یہاں بلا لیا ہے ذرا دکان کے کام کاج میں مدد ہو جاتی ہے۔ میں یہیں دکان پر سویا کروں گا۔ واہگورو، واہگورو، اب تو دن چڑھ گیا ہے۔ او بنیے او بنیے، اُٹھ دکان کھول، کیا دیکھتا ہے۔ دن کبھی کا نکل آیا ہے۔"

درشن سنگھ بنیے کو آوازیں دینے لگا تھا۔ بیچارہ بنیا اس مکان کی نچلی منزل میں جہاں میں رہتا ہوں۔ آٹا، لون، تیل، سبزی سوڈا واٹر، اور پکوڑے بیچتا ہے۔ اس کی بیوی کا رنگ ذرا کھلتا ہوا سا ہے۔ اور وہ ہمیشہ مینا کی طرح چہکا کرتی ہے۔ دکان پر کام کرتی ہے۔ گاہکوں کو مسکرا کر سودا دیتی ہے، نگر کے

کنوارے لڑکے، بدصورت بیویوں کے ادھیڑ خاوند، پوربیے دھوبی، نائی، موچی اور اکھاڑے میں کشتی لڑنیوالے پہلوان سبھی بنئے کی دکان سے سودا لیتے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ کر پکوڑے کھاتے ہیں۔ بڑی رغبت سے یا بنئے کی بیوی سے "سوڈا واٹر کی ایک بوتل کھولدینا" اور آج تو بنیائن خوب بنی ٹھنی ہو" ہی ہی ہی......"

اور بنئے کی بیوی بوتل سے کاگ اُڑاتے ہوئے کہتی ہے

"ہسٹ مردود۔"

۸

دوسرے دن درشن سنگھ کے پہلے مصرعے نے ہی مجھے جگا دیا۔ گھڑی کی طرف دیکھا تو کم بخت پورے چار تھے۔ میں نے سوچا یہ آدمی ہے یا گھڑیال۔ میں نے لحاف میں منہ چھپا کر اپنی بدبختی پر رونے کی کوشش کی۔ لیکن جلتی ہوئی آنکھوں میں آنسو کیسے آتے۔ میں نے درشن سنگھ کو، اس کے آبا و اجداد کو، اپنی قسمت کو، فرید بابا کو لاکھ لاکھ کوسنے دیئے۔ اتنے میں میں نے سنا کہ نچلی منزل سے بھی ایک ہلکی ہلکی صدا اُٹھ رہی ہے۔

اوم جے جگدیش ہرے
جے جگدیش ہرے اے اے .....

بنیا اپنی پھٹے ہوئے ڈھول کی سی آواز میں گا رہا تھا۔ وہی صدق عجز، اور پاکیزگی، لیکن کچھ خاص قسم کی تیزی۔ جو گویا درشن سنگھ سے کہہ رہی تھی۔ "تم ہمیں کیا سمجھتے ہو، ہم تم سے ہیٹے نہیں ہیں۔ ہمیں بھی اپنا کچھ کم پیارا نہیں۔

اوہنہہ!

اور اب بنیا اور اس کی بیوی اور دونوں بچے اپنی ملی جلی آوازوں کیساتھ کہہ رہے تھے۔

"بھگت جنن کے سنکٹ چھن میں دوز کرے"

(وہ اپنے بھگتوں کے دکھ ایک پل میں دور کر دیتا ہے۔)

اوم

جے جگدیش ھرے اے اے۔

اور بنیے کی بیوی کوئل کیطرح کوک کوک کر کہہ رہی تھی۔

تم بِن اور نہ دُوجا۔

تم بِن اور نہ دوجا۔

آس کروں جس کی۔

اوم جے جگدیش ہرے ہرے۔

ایک درمیانی وقفے میں درشن سنگھ نے خوش ہو کر بنیے

سے اونچی آواز میں کہا۔

"بنیاجی، آہا واہگورو کا نام لینے میں کتنا آنند ہے؟"

بنیے نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ "آہا رام کی مہما ——

اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

▲

درشن سنگھ کے آتے ہی نگر میں دھرم کرم کے چرچے ہونے لگے۔ یہ نگر لاہور ہی کی آبادی کا ایک حصّہ ہے یہاں اس لئے کوئی خاص مذہبی مجلسیں قائم نہ ہوئی تھیں۔ لے دے کر ایک سنگھ سبھا تھی۔ جس کا اجلاس سال میں شاید ایک مرتبہ ہی ہوتا تھا۔ جس مکان میں میں رہتا تھا۔ اس سے بس دس پندرہ قدم آگے جا کر مغرب کی طرف ایک مسلمان قلعی گر، ایک مسلمان رنگساز، ایک مسلمان حکیم اور ایک مسلمان سائیکل کے مستری اور ایک مسلمان سبزی فروش کی دکانیں تھیں۔ ان سے آگے کھلی جگہ تھی۔ جہاں اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ یہاں سکھ مسلمان، ہندو اور چمار پہلوان سب اکٹھے ہو کر کُشتی لڑا کرتے تھے۔

لیکن درشن سنگھ کے آتے ہی لوگوں میں گویا صدق وایمان کی روح پھونکی گئی۔ ست سری اکال اور اوم جے جگدیش ہرے کے بعد مسلمان رنگ ساز نے یہ مناسب سمجھا کہ نورِ ایمان مردہ دلوں میں تازہ

کیا جائے۔ چنانچہ اب کچھ دنوں سے اس کی دکان پر ایک سبز منکوں والے اور سبز چغے والے پیر جو بیک وقت پیر اور مولوی اور عامل تھے۔ تشریف لانے لگے۔ اب رنگ ساز کی دکان پر ہمیشہ ایک جمگھٹا سا لگا رہتا تھا اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی تھیں اور سائیکلوں کے مستری کے نوجوان لڑکے یا علیؑ یا علیؑ کرتے اور خوشی سے ناچتے ہوئے گزر جاتے تھے مسلمان سبزی والے کا تمباکو کا خرچ بڑھ گیا تھا۔ اور حکیم صاحب ایک دن اپنے چھوٹے لڑکے کو بنیے کی دکان پر پکوڑیاں کھاتے —— دیکھ کر غصے میں آکر پیٹنے لگے۔

پھر جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو بولے۔ "یہ کم بخت ہمیشہ گندی چیزیں کھاتا ہے۔ میں نے اِسے سو بار سمجھایا ہے۔"

چند روز کے بعد جب میں ایک شام کو دفتر سے تھکا ماندہ، واپس آرہا تھا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ نگر کا بازار جھنڈیوں سے سجا ہوا ہے اور بازاروں میں سنگھ سبھا کے والنیٹر ٹولیاں بنائے جگہ جگہ کھڑے ہیں۔ جن میں سے کئی ایک نے گلے میں ہار پہن رکھے ہیں۔ اکثر لوگ پان چبا رہے ہیں۔ قہقہے لگا رہے ہیں۔ ننھے ننھے سکھ لڑکے بھی کرپانیں پہنے ہوئے ہیں اور اُبلے ہوئے چنے کھا رہے ہیں۔ یا

کھٹے کچالو، یا پلیٹوں میں جمی ہوئی سرخ سرخ چینی گھاس کی کھیر،

درشن سنگھ نے مجھے دیکھتے ہی ست سری اکال کا بجے کارہ لگایا۔ "آہا، بابو جی، آج باباجی رہا ہو گئے"۔

"کون سے باباجی؟"

" واہ ——— آپ کو بھی پتہ نہیں، آپ تو روز اخبار پڑھتے ہیں۔ وہی واہگورو جی کے سچے خالصہ باباٹیک سنگھ جی۔"

بنیے کی دکان پر کھڑے ہوئے ایک والنٹیر نے کہا۔ زندہ شہید باباٹیک سنگھ جی رہا ہو گئے ہیں۔ آج ہم ان کو ایڈریس دیں گے۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔" میں نے کہا۔

ساتھ والے مسلمان قلعی ساز کی دکان پر شہید گنج کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا۔ اور گرما گرم" بحث ہو رہی تھی۔

دوسرے دن میری نیند روز کی طرح اُچاٹ ہو گئی۔ لیکن باقی آوازوں کے ساتھ ہی ایک ریکارڈ بھی بج رہا تھا۔ مکان کے دوسرے حصے میں میری طرح ایک اور کرائے دار رہتا تھا میری ہی طرح ایک دفتر میں ملازم تھا۔ اور اب وہی منہ اندھیرے اُٹھ کر ریکارڈ بجا رہا تھا۔

نو بجے کے قریب وہ مجھے سیڑھیوں پر ملا۔ میں نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا۔ "آج تو آپ صبح

ہی اُٹھ بیٹھے۔"

"ہو ہو ہو" بابو جی نے ہنستے ہوئے کہا۔" ہا ہا ہا، مجھے مہاتما جی کا ریکارڈ بہت پسند ہے۔ آپ کو پتہ ہے۔ مہاتما جی کو یہ گیت خاص طور پر پسند ہے۔"

"کونسا گیت۔؟"

"یہی جس کا میں صبح —— ریکارڈ بجا رہا تھا۔" اُٹھ جاگ مسافر بھور بھئی۔" کیسا میٹھا گیت ہے۔ اسے صبح سن کر طبیعت بشاش ہو جاتی ہے۔"

اور پھر وہ یہ گنگناتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔

"اُٹھ جاگ، اُٹھ جاگ، مسافر بھور بھئی، اب رین کہاں، جو سووت ہے اے۔ اے"

▲

پرسوں ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ گوشت سے بھرے چھکڑے یا تانگے بوچڑ خانے سے آتے ہوئے اسی طرف سے گزرتے ہیں میونسپلٹی کی سڑک پر بہت سے گڑھے پڑ جانے کیوجہ سے اکثر چھکڑوں کے بیل یا تانگوں کے گھوڑے چوٹ کھا کر گر پڑتے ہیں۔ اور کئی بار گوشت زمین پر گر جاتا ہے۔ چنانچہ پرسوں بھی ایک تانگہ۔

سکھ دکاندار کی دکان کے سامنے الٹ گیا۔ اور گوشت دکان کے قریب زمین پر گر پڑا۔ تانگے والے کو بہت سی چوٹیں لگیں۔ چنانچہ پرسوں شام ہی کو "پریم سبھا" کے سیکرٹری میرے پاس آئے۔ اور بولے "اس کا تدارک ہونا چاہیئے۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے میونسپلٹی کو لکھ دیجیئے۔"

بولے۔ "نہیں آپ میری بات نہیں سمجھے۔ یہ راستہ ہی بوچڑوں کے لئے بند ہوجانا چاہیئے۔ یہ ہندو سکھ آبادی ہے۔ ہماری توہین ہوتی ہے۔ ہمارے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس کے آپ دیکھئے نا، یہاں چھوٹے بچے، لڑکے بالے گھومتے رہتے ہیں اگر کسی کے چوٹ لگ جائے اگر کوئی مر جائے تو ——"

میں نے کہا یہ تو درست ہے مگر بوچڑ خانے کا بھی تو یہی راستہ ہے اور ——"

پریم سبھا کے سیکرٹری بولے۔ "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ ہمیں اخبار میں خبر بھیجنے کیلئے ایک مسودہ بنا دیجئے۔"

میں نے کہا۔ "یہ پریم سبھا کب بنی ہے؟"

وہ بولے۔ "تین چار دن ہوئے۔ یہاں چار پانچ ہندوؤں نے مل کر بنائی ہے۔ آپس میں مل بیٹھنا اچھا ہوتا ہے۔"

"پنڈت سدھ دیو کے دو لیکچر بھی ہو چکے ہیں۔ سبھی لوگ آئے ہوئے تھے آپ کہاں رہے؟"

"میں ۔؟ ——— میں نے کہا۔ "کس مضمون پر لیکچر ہوئے تھے ۔"

"جاپان میں ویدک دھرم ۔" نہایت اعلےٰ لیکچر تھا۔ پنڈت جی نے ثابت کر دیا کہ ساری دنیا ویدک دھرم قبول کرنے کو تیار ہے۔ مگر ہم لوگ بہت سست ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں ساری دنیا میں اپنے پرچارک بھیجنے چاہئیں انھوں نے بتایا کہ ......"

میں نے کہا۔ "میں کل آپ کو مسودہ تیار کر دوں گا۔"

دوسرے دن صبح ہی یہاں ایک فساد ہو گیا۔ ہندو۔ مسلم سکھ فساد، خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ساری نو آبادی میں ہراس پھیل گیا کے دُکے پر کرپانوں اور چھریوں سے حملے ہونے لگے۔ سکھوں کی کرپانوں نے، بوچڑوں کی چھریوں نے پوربیوں کی لاٹھیوں نے خوب دادِ شجاعت دی۔ صبح سے لیکر دوپہر تک نعرے بلند ہوتے رہے۔

پریم سبھا کے سیکرٹری نے شام ہی کو للکار کر کہہ دیا تھا کہ "بوچڑوں کو اس بازار میں سے گزرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

بوچڑوں نے سربازار کہہ دیا تھا کہ "وہ صبح اسی سڑک پر سے

گزریں گے اور ضرور گزریں گے اور دیکھیں گے کہ کون مائی کا لال انہیں روکتا ہے۔

دوسرے دن صبح ہی بوچڑ اپنے چھکڑوں اور تانگوں پر گوشت لادے ہوئے گذرنے لگے۔ سبھی خاموش تھے کسی کی ہمت نہ پڑی کہ انھیں روکتا۔ کہ اتنے میں درشن سنگھ نے للکارا۔

"ٹھہر جاؤ۔" اور کرپان لے کر میدان میں آگیا۔

مسلمان رنگ ساز نے کہا "اللہ-ہو-اکبر۔"

بنیا جلد جلد اپنی دکان بند کرنے لگا۔ وہ اسی دکان میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے بھی نچلی منزل کا بڑا دروازہ بند کرادیا۔ اور پھر تماشا دیکھنے کے لئے کھڑکی میں آبیٹھا لیکن ذرا ہٹ کر، تاکہ کہیں کوئی اینٹ میرے ہی نہ آلگے۔

پریم سبھا کے حمایتی پوربیوں نے حملہ کر کے مسلمان حکیم اور رنگ ساز اور سائیکل اور سبزی والے کی دکانیں لوٹ لیں۔ سکھ اور بوچڑ لڑ رہے تھے۔ اتنے میں گھاٹی دروازے سے کمک پہنچ گئی۔ اور مہنت نگر سے بپھرے ہوئے ہندو بھی۔ میں نے مصلحتاً کھڑکی بند کردی۔ میری کھڑکی پر اینٹیں پھینکی جارہی تھیں۔ بنیئے کی دکان توڑی جارہی تھی۔

چیخیں، درد ناک، ہیبت ناک چیخیں، نعرے، فلک شگاف نعرے، لاٹھیوں کے چلنے کی آوازیں۔

دکانوں کے دروازے ٹوٹنے کی آوازیں۔

دو تین گھنٹوں کے بعد یک لخت چاروں طرف موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ اب فساد مہنت نگر سے آگے بڑھ کر دوسرے محلوں نوآبادیوں اور شہر کی گلیوں کوچوں میں پہنچا ہوا معلوم ہوتا تھا دور دور نعروں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں لیکن یہاں —— موت کی سی خاموشی تھی۔

میں نے چند منٹ کے سکوت کے بعد آہستہ سے کھڑکی کا پٹ کھول کر دیکھا۔

دکانیں لٹی پڑی تھیں۔ اشیاء بازار میں بکھری ہوئی تھیں۔ چند لوچڑا اور سکھ مرے پڑے تھے۔ کئی زخمی پڑے کراہ رہے تھے جن میں میرا پڑوسی بنیا بھی تھا۔ اور اس کی بیوی بھی، جو اسے بچانے کی کوشش میں بری طرح زخمی ہو گئی تھی۔ وہ میری کھڑکی کے نیچے پڑی تھی۔ اِسے اس حالت میں پڑے دیکھ کر اس کی وہ تصویر میری آنکھوں میں پھر گئی۔ جب میں نے اسے ایک دن نچلی منزل میں راکھی کے روز دیکھا تھا۔ میں دالان میں کھڑا سائیکل صاف کر رہا

تھا کہ وہ بے تحاشا بھاگتی ہوئی آکھڑی ہوئی. اس کا ہنستا ہوا چہرہ، رنگین کنارے والی دھوتی اور سڈول بازو۔ مجھے ایسا معلوم ہوا تھا کہ ساری دنیا خوبصورت رنگوں سے معمور ہو گئی ہے۔ اور پھر دوسرے لمحے ہی میں وہ میرے سامنے سے غائب ہو گئی تھی. لیکن اس کی وہ حسین تصویر، وہ رنگین پرچھائیں ایک عرصہ تک میرے آئینۂ دل پر لرزتی رہی تھی.

اور اب ؟

جب میں نے پھر کھڑکی بند کی تو سائیکلوں کا بوڑھا مستری اپنے نوجوان لڑکے کی لاش کو اپنے کاندھوں پر اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا.

▲

فساد کو ایک عرصہ ہو چکا ہے. اب یہاں امن امان ہے۔ فجو اور ماتا دین کو پھانسی کی سزا ہو چکی ہے۔ بنیا اپنے بال بچوں کو لیکر رہتک چلا گیا ہے۔ بوڑھا مستری جس کے دونوں بچے فساد میں ہلاک ہو گئے تھے. اب گردن جھکائے سائیکل درست کرتا ہوا نظر آتا ہے. درشن سنگھ کا کوئی پتہ نہیں۔ نند سنگھ نے مجھے ایک دن آہستہ سے بتایا کہ وہ آج کل شکارپور میں گرہستی ہے۔ اور

اب اس نے اپنا نام سکھ چین سنگھ رکھا ہوا ہے۔ مسلمان رنگریز نے کہا۔ کہ سبز چوغے والا مولوی آجکل جلال پور کی مسجد میں امام ہے۔ اب آہستہ آہستہ لوگ ایک دوسرے سے اچھی طرح ملنے جلنے لگے ہیں۔

پریم سبھا کا سیکرٹری، اب رادھا نگر میں رہتا ہے۔ لوچڑ لوگ گوشت کو ڈھانپے ہوئے اسی طرح سڑک پر سے گزرتے ہیں۔ سڑک پر میونسپلٹی کے گڑھے اسی طرح موجود ہیں۔ لیکن تعزیری پولیس ضرور تعینات کر دی گئی ہے۔

اب مجھے صبح چار بجے کوئی نہیں جگاتا۔ بابو جی، جو دوسرے حصے میں ہیں۔ اب ریکارڈ نہیں بجاتے۔ کیونکہ وہ فساد میں ٹوٹ گئے تھے۔ اب کوئی دل کا چراغ "روشن کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اب بالکل امن ہے۔ لیکن میں پھر بھی احتیاطاً اخبار میں ہر روز شکارپور اور جلالپور کی خبریں پڑھ لیا کرتا ہوں !!!

سفید پھول

موضع مہندر کے موچی کا نام کبالا تھا۔ کبالا کو آج تک
کسی نے گالی دیتے یا جھوٹ بولتے نہ سنا تھا۔ طبعی شرافت کے
علاوہ شاید اس کی یہ وجہ بھی تھی کہ وہ پیدائشی گونگا تھا۔ یوں بھی تو
مہندر کا گاؤں بودھوں کا گاؤں تھا۔ جہاں ہر ایک فرد سچائی اور
اہنسا کا پجاری تھا۔ لوگ جھوٹ بہت کم بولتے تھے۔ چوری
چکاری اور ڈکیتی کا نام تک نہ تھا۔ پچھلے دو سو برس میں وہاں
قتل کی ایک بھی واردات نہیں ہوئی تھی۔

لوگ مہندر میں اس طرح خوش و خرم رہتے تھے
جیسے جنت میں۔ یہ بات الگ ہے کہ سماج کی الجھنوں میں پھنس
کر گاؤں کے لوگ بعض اوقات ایسے کام بھی کر بیٹھتے تھے۔

جن پر انھیں بعد میں پچھتانا پڑتا تھا. لیکن ایسی باتیں بہت کم پیش آتی تھیں اور پھر یہ تو سماج کی الجھنوں کا قصور تھا۔ نہ کہ ان کا.

کبالا کی دکان پہاڑ کی چوٹی کے قریب دیودار کے دو۔ مضبوط درختوں کے سائے تلے، لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر تیار کی گئی تھی۔ اور یہ کبالا کی دکان بھی تھی. اور اس کا آبائی گھر بھی۔

مہندر کا خوب صورت گاؤں نیچے تلیٹی میں واقع تھا اور جب ہوا دیودار کے درختوں میں گزرتی ہوئی گیت گاتی اور سورج دیوتا اپنے سنہری رتھ پر سوار ہوکر اونچے دیوداروں کی چوٹیوں کے اوپر سے گزرتے تو نیچے تلیٹی میں گاؤں کی خوبصورت منقش چھتیں اور پرانے بودھ مندر کا منگولی برج شام کی سنہری کرنوں میں جگ مگ جگ مگ کرنے لگتا.

سورج نکلتے ہی کبالا دکان کے باہر ایک چھوٹے سے اخروٹ کے درخت کے نیچے آبیٹھتا اور جوتیاں بناتے بناتے اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے دور نیچے راستے پر گزرتی ہوئی مہ جبینوں کی طرف دیکھتا۔ جو مٹی کی گاگریں کولھوں پر رکھے یا سر پر اٹھائے قطار باندھے گیت گاتی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی جاتی تھیں. اور جب وہ پگڈنڈی پر سے گزر جاتیں۔ تب بھی وہ اُن

ہی کیطرف دیکھتا رہتا۔ اس وقت کبالا کو ایسا محسوس ہوتا گویا ان کے پاؤں سے چھو جانے سے راستے کی مٹی کا ہر ذرہ کندن بن کر دمک رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور اس کے دل کے اندھیرے میں ایک سونے کی لکیر سی کھنچ جاتی۔ اور اس کا جی چاہتا کہ وہ زور زور سے گائے۔ یہاں تک کہ دور نیچے راہ چلتی ہوئی ماہ جبینوں کے پاؤں رک جائیں اور وہ نازک اندام سرو قد نیناؔ گاؤں کے نمبر دار کی لڑکی بھی ایک ہاتھ گاگر پر رکھے اور دوسرے ہاتھ سے دھوتی کا پیلا آنچل سنبھالے اس کی طرف تکنے لگ جائے۔ اور ..... چوٹی کے اوپر چھوٹے سے نیلے آسمان میں اڑتے ہوئے بادل یکایک تھم جائیں اور اس کا پرسوز گیت سننے کیلئے اونچے اونچے دیوداروں کے اوپر جھک جائیں —— لیکن جب کبالا اپنے لب کھولتا تو اس کے منہ سے ایک دبی سی چیخ نکل جاتی، کرخت اور بلند، جسے سن کر آس پاس کے درختوں پر بیٹھے ہوئے نازک مزاج لگو، سنہولے اور رت گلے پر پھڑپھڑاتے ہوئے اڑ جاتے اور کبالا شرمندہ ہو کر اپنے لب زور سے بھینچ لیتا۔ جیسے انھیں سوت کے ٹانکوں سے اس نے خود ہی سی دیا ہو۔

کبالا کی صورت شکل بہت اچھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی

آنکھیں کسی وحشی ھرن کی سی تھیں اور چہرہ بیضوی، اور جب وہ اخروٹ کے درخت کے تلے زانو تہ کئے جوتے بنا رہا ہوتا تو اس کا پاک اور معصوم چہرہ بالکل کسی دیوتا کی طرح معلوم ہوتا. صورتیں کس قدر دھوکا دیتی ہیں۔ کبالا کو دیکھ کر کسی کو یہ گمان نہ ہوسکتا تھا کہ آج سے دو سو برس پہلے اسی موچی کے ایک بزرگ نے اس گاؤں کے ایک غریب بدھ سادھو کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا. کیونکہ اسے شک تھا کہ بودھ سادھو اس لڑکی کو ورغلا رہا تھا جس سے کبالا کے اس بزرگ کو محبت تھی.

گاؤں میں قتل کی واردات شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی. اور گاؤں کے پنچوں نے بڑے غور وفکر کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ کسی کی جان کے بدلے دوسرے کی جان لینا اُدھرم ہے۔ اس لئے انھوں نے کبالا کے بزرگ کو گاؤں سے باہر نکال دیا تھا اور اعلان کر دیا تھا۔ کہ جب تک اس خاندان کی سات پشتیں اس گناہ کا کفارہ ادا نہ کرلیں۔ اس خاندان کے کسی فرد کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ وہ گاؤں کی حدود کے اندر قدم رکھ سکے. اس دن سے لیکر گاؤں کے موچی کی دکان پہاڑ کی چوٹی کے قریب واقع تھی. گرمی ہو یا سردی، دھوپ ہو یا

برف چار پشتوں سے مہنڈر کے موچی نے گاؤں میں قدم نہ رکھا تھا۔ وہ بہت سی چیزیں کھنیتر کے گاؤں سے لے آتا تھا جو مہنڈر کے کوہساروں کی دوسری طرف ایک چھوٹی سی وادی میں واقع تھا اور اب تو کھنیتر کے موچی خاندان سے مہنڈر کے موچی کے تعلقات اس قدر مضبوط ہو چکے تھے کہ مہنڈر کے موچی کا خاندان بودھ پنچوں کی سزا کو قریباً بھول گیا تھا۔

ہاں! نوجوان کبالا کے دل میں کبھی کبھی ایک ہلکی سی ٹیس اُٹھتی کیونکہ وہ نوجوان تھا اور اکیلا اور گونگا، اس کے ماں باپ مر چکے تھے اور کھنیتر کے موچی خاندان کے افراد اس کے گونگا ہونے کی وجہ سے اس سے متنفر تھے اور وائی اور ذی شی دونوں بہنیں اس کا مذاق اُڑایا کرتی تھیں اور اس کے ہاتھ پاؤں کی دلچسپ حرکات کی جن سے وہ اپنی زبان کا کام لیا کرتا تھا، نقلیں اتارتی تھیں اور جب ان کے ہنسی ٹھٹھے میں اُنکے تینوں بڑے بھائی بھی شامل ہو جاتے تو گونگے کے دل کا زخم رس رس کر بہنے لگتا۔ اور وہ چیخیں مار کر وہاں سے بھاگ جاتا۔

کبالا کا ایک دوست بھی تھا اس کا نام تھا کھنڈرا۔ کبالا نے کھنڈرا کو ایک دن کھنیتر سے واپس آتے ہوئے راستے میں پڑا پایا تھا۔ وہ بھوک سے بیتاب ہو کر چلا رہا تھا۔ اس کی ڈائن ماں اُسے راستے ہی میں چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ کبالا کھنڈرا کو اٹھا کر اپنے گھر لے آیا تھا۔ اس نے

اسے پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا اور کھنڈا ابھی کبالا کو بہت چاہتا تھا، کئی بار جب کھنڈا کبالا کو اداس دیکھتا تو شوخ نگاہوں سے اس کی طرف تاکتا اور پھر دم ہلا کر اسطرح چیختا گویا کہہ رہا ہے" گونگے بھیا کیوں اداس ہو میری طرف دیکھو۔ میں بھی تمہاری طرح بات چیت نہیں کر سکتا. لیکن کیا میں خوش نہیں ہوں۔ وہ دیکھو اس اخروٹ کی ٹہنی پر کیسی خوبصورت چڑیا بیٹھی ہے اے لو وہ اُڑ گئی اور پھر کھنڈا چیختے چیختے کبالا کے قدموں کے گرد ناچنے لگتا۔ یہاں تک کہ کبالا کا غم دور ہو جاتا۔ اس کے چہرے پر بشاشت آجاتی اور وہ اپنے پیارے کتے کی پیٹھ کو زور سے تھپک کر اپنے پاس بٹھا لیتا۔ اس وقت اس کی نگاہیں صاف کہہ رہی ہوتیں" کھنڈا بھیا تم بہت شوخ ہو۔ شوخ اور پیارے۔ شوخی تو اروائی اور ذی شی میں بھی ہے لیکن وہ پیاری نہیں ہیں اور نینا میں شرارت نہیں۔ پر وہ بہت اچھی ہے، کیا تم نینا کو نہیں جانتے وہ ہمارے گاؤں کے نمبر دار کی لڑکی ہے۔ اور اس دن اپنے باپ کیساتھ یہاں آئی تھی۔ نہیں جانتے؟ ذلیل کُتے، چلو ہٹو یہاں سے۔ اور کھنڈا غرا کر کہتا. مجھے نمبر دار کی کیا پروا ہے اور میں کسی نینا وینا کو نہیں جانتا اور تم مجھے اپنے پاس سے نہیں ہٹا سکتے۔ میں جنگل کے بھیڑیے کی مانند ہوں مجھے کوئی معمول ایسا ویسا کتا نہ سمجھنا! سمجھے؟" جب کبالا نے نینا کو پہلے پہل دیکھا تو اس دن دھند

چھائی ہوئی تھی۔ ایک ہلکی لطیف دُھند جو دیودار کے درختوں کو اپنے سفید لبادے میں پیٹتے ہوئے جنگل کی سبز جھاڑیوں سے لیکر چوٹی کے اوپر آسمان میں پھیلے ہوئے بادلوں تک چلی گئی تھی۔ ساری فضا میں صبح کا سناٹا تھا نہ ہوا چل رہی تھی۔ نہ پرندوں کی بولیاں سنائی دیتی تھیں۔ کیونکہ جب دھند آجائے تو پرندے بھی خاموش ہو جاتے۔ اس گونگی دنیا میں کبالا پہاڑی جھرنے سے نہا کر واپس آرہا تھا کہ راستے میں ایک چٹان پر کھڑے ہوئے اس نے دھند کی دیوی کو دیکھا۔ ہاں یہ دھند کی دیوی ہی تو تھی۔ سرو قامت، سر سے پاؤں تک ایک سفید دھوتی میں ملبوس۔ اس کا چہرہ کبالا کو ایسا معلوم ہوا گویا شبنم کے قطروں میں دھلا ہوا گلاب کا پھول دھند کی ہلکی اور سپید لہروں میں تیر رہا ہے۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اور منہ کھولے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ دھند کی دیوی نے کہا "میں رستہ بھول گئی ہوں میں نینا ہوں مجھے گاؤں کا راستہ دکھا دو" کبالا چند لمحوں کیلئے بت کیطرح کھڑا رہا۔ پھر آہستہ سے پیچھے مڑ گیا۔ اس نے نینا کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھ آنے کو کہا دھند گہری ہو رہی تھی۔ لیکن اب وہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور کبالا سوچ رہا تھا تم نینا ہو۔ تم دھند کی دیوی ہو۔ تم رستہ بھول کر آگئی ہو۔ رستہ، کبالا نینا کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ نازک چھوٹے سے گلابی پاؤں! اچھا تو وہ چپل کیوں نہیں پہنے ہوئے؟ وہ اب ایک ایسا اچھا چپل تیار کرے گا

کہ دھند کی دیوی بھی اسے پہن کر خوش ہو جائے پتلا سا چمڑا اور اس پر باریک نقرئی تاروں کے پھول، خوبصورت اور ملائم جیسے نینا کے پاؤں اس کا جی چاہا کہ وہ دیوی کے قدموں میں اپنا سر رکھ دے اور کہے کہ اپنے پجاری کو ان کی پوجا کر لینے دو اور پھر یکایک اسے خیال آیا کہ وہ تو کچھ بھی نہیں کر سکتا اور وہ اس رازِ عظیم کو اپنے دل کے انتہائی گوشوں میں چھپانے کو تیار ہو گیا۔ اب چلتے چلتے اسے ہر لحظہ ڈر رہنے لگا کہ نینا اس سے کوئی بات نہ پوچھ لے ایک بات، ایک لفظ، اور پھر وہ جان لے گی کہ وہ گونگا ہے اور قدرت نے اسے ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیا ہے خاموش اور بےحس، شاید پیدا ہونے پر وہ ایک بار چلایا ہو گا۔ لیکن اب تو گویائی کی ایک رمق بھی باقی نہ تھی۔ اور اس کا سازِ حیات بالکل بےحس، بیجان اور موت کیطرح ساکن تھا۔ گاؤں کی حد کے قریب پہنچ کر کبالا کھڑا ہو گیا۔ اور پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے دھند میں لپٹے ہوئے راستے کی طرف اشارہ کیا۔ نینا نے ایک لمحہ کیلئے رک کر پوچھا۔ "تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ میں نے پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ تم کہاں رہتے ہو؟"

کبالا نے پہاڑ کی چوٹی کیطرف اشارہ کیا اور آنکھیں نیچی کر کے کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد نینا بولی اوہ ... تم ہو کبالا۔" کبالا دیر تک گردن جھکائے بانہ لٹکائے کھڑا رہا۔ اور جب وہ چلنے لگی تو اس نے اپنی بڑی بڑی وحشی ہرن کی سی آنکھوں سے نینا کیطرف دیکھا۔ وہ کیا کہنا چاہتا تھا؟ وہ کیا کہہ سکتا تھا کاش

وہ کچھ کہہ سکتا۔ نینا آہستہ سے مڑ گئی۔ سپید دھند میں اس کی مٹتی ہوئی تصویر کو دیکھ کر کبالا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

جس دن نینا رستہ بھول کر کبالا کے دل میں اُتر آئی تھی۔ اس دن سے کبالا کو ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے زمین کے سوئے ہوئے سب سپنے جاگ اٹھے ہیں مہنڈر کے خلد زاروں میں ایک نئی رعنائی اور دلکشی آگئی ہے اور اس کی روح میں خوشی اور غم کی حدیں پھیلتے پھیلتے ایک دوسرے سے مل گئی ہیں شاید اگر وہ گونگا نہ ہوتا تو اس کے جذبات کی بلندی کا یہ عالم نہ ہوتا اگر اس کی زبان نینا سے اس کے دل کا مدعا کہہ سکتی تو شاید اس کی وارفتگی کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی۔ لیکن اب جب کہ اس کے جذبات کے سیل بکیراں کے چاروں طرف قدرت کے لگے ہوئے آہنی بند دیکھے تو اس کی روح کی تڑپ اور شعریت اس کی بنائی ہوئی چپلوں اور جوتیوں میں منقلب ہو گئی۔ ان دنوں اس نے چپلوں اور جوتیوں کے ایسے ایسے نفیس اور نادر نمونے ایجاد کئے۔ اس کی شہرت بہت جلد اطراف میں پھیل گئی۔ اور لوگ دور دور سے آکر اس سے جوتے اور چپل بنوانے لگے۔ کھنیتر کے موچی نے اس سے اشاروں ہی اشاروں میں کئی بار کہا کہ اب جبکہ تمھاری دکان چمک اٹھی ہے تمھیں شادی کر لینی چاہیئے۔ اور اب وہ بغیر کسی معاوضے کے کبالا کو لرِوائی یا ذی شی کا رشتہ دینے کو تیار تھا۔ ذی شی اور لرِوائی بھی

تو اب اسے اتنا دق نہ کرتی تھیں. اب ان کی نگاہوں میں شوخی کیساتھ احترام یا شاید کچھ اور جذبات بھی ملے ہوئے تھے شاید اب وہ دونوں اپنی اپنی جگہ کبالا کو اپنا ہونے والا خاوند سمجھ رہی تھیں اب انھیں کبالا کی بڑی بڑی آنکھوں میں دیوتاؤں کے سے چہرے میں، دل آویز رنگت میں اور لمبے گھٹیلے جسم میں جراتِ مردانگی اور خوبصورتی کے تمام لوازم دکھائی دیتے تھے. جس طرح تالاب میں کاغذ کی ایک ہلکی سی ناؤ ڈال دینے سے بھی لہریں پیدا ہو جاتی ہیں اور پھر وہ بڑھتی ہوئی دائرے بناتی ہوئی چاروں طرف پھیل جاتی ہیں. اسیطرح کبالا کی محبت کی ناؤ نے بھی مہندڑ کی ساکن فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا. اور اب یہ لہریں چاروں طرف پھیل گئی تھیں کھنڈا کو اس بات کا پتہ لگ گیا تھا. نینا کی سہیلیوں کو اور شاید گاؤں کے اور افراد کو بھی. جب گاؤں کی دوشیزائیں نینا کو چھیڑتیں تو نینا کو کبالا پر بہت غصہ آتا تھا. بیوقوف گونگا، پاگل چمار نہ جانے وہ اسے کیا کیا کچھ کہہ ڈالتی تھی. اور بیچارے کبالا کو کیا پتہ تھا کہ نینا کا باپ تو ایک عرصہ ہوا مینا کے بیاہ کا معاملہ طے کر چکا تھا اس نے نینا کو تاشی پور کے بودھ سردار سے بیاہ دینے کا وعدہ کر لیا تھا. بڑی مشکل سے تین ہزار روپیہ پر فیصلہ ہوا تھا. تاشی پور کا سردار بہت کنجوس تھا. اور وہ ہزار سے زیادہ دینے کا نام نہ لیتا تھا. تب نینا کے باپ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تاشی پور کے سردار سے اپنی لڑکی بیاہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی چہیتی بیٹی کو جہنم میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دے. ہاں تاشی پور جہنم سے کم نہ تھا.

اونچے اونچے سنگلاخ پہاڑ دشوار گزار راستے ہر وقت برف و باراں، تاشی پور برف کا جہنم تھا۔ وہ یقیناً اپنی نازک اندام بیٹی کو تاشی پور کے بدھ سردار سے نہیں بیاہے گا۔ آخر بڑی مشکل سے تین ہزار پر فیصلہ ہوا تھا۔ لیکن کبالا اپنی جگہ خوش تھا۔ نینا دوبار اپنے باپ کیساتھ اس کی دکان پر چپلوں کا ماپ دینے آئی تھی۔ نینا کے لئے اس نے ایسے خوبصورت چپل تیار کئے تھے۔ جنھیں دیکھ کر گاؤں کی دوشیزائیں رشک سے جل گئی تھیں۔ نینا کے پاؤں کو جنھیں قدرت نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا چھو کر کبالا کے دل میں یہ خواہش آگ کی طرح بھڑک اٹھی تھی۔ کہ وہ ان دو کنول کے پھولوں کو اُٹھا کر اپنے سینے میں چھپالے۔ نینا کے باپ نے اس کے کام سے خوش ہو کر اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بودھ پنچوں کو کہہ کر کبالا کے خاندان کی سزا منسوخ کرانے کی کوشش کرے گا اور غالباً جلد ہی کبالا کو اپنے گاؤں میں واپس آنے کی اجازت مل جائے گی اور پھر نینا کی آنکھیں بھی خوشی سے چمک اُٹھی تھیں۔ اور اس نے نہایت ملتجیانہ انداز میں اپنے باپ سے درخواست کی تھی کہ وہ ضرور غریب کبالا کے خاندان کی سزا منسوخ کرادے۔ ان باتوں کو یاد کر کے وہ جوتیاں بناتے بناتے خود ہی مسکرا پڑتا۔ ہاں وہ بہت خوش تھا۔ وہ دن بھر اچھے اچھے چپل بناتا۔ کھنڈا کیساتھ کھیلتا اور صبح و شام اخروٹ کے درخت تلے کھڑے ہو کر دور نیچے گھاٹی کے سنہری راستے پر گزرتی ہوئی ماہ جبینوں کی طرف

دیکھتا۔ ان میں نینا بھی ہوتی تھی پیلے آنچل والی نینا۔

اور پھر ایک دن گاؤں کے لوہار نے کبالا کو بتایا کہ گاؤں کے نمبردار کی لڑکی نینا کی شادی ایک دو دن میں تاشی پور کے بُدھ سردار سے ہونیوالی ہے شادی اونتی پور میں ہوگی جو مہنڈر اور تاشی پور کی درمیانی حد پر اونچے برفانی پہاڑوں کی ایک تنگنائے میں واقع تھا۔ شادی کی رسوم اونتی پور کا مقدس بودھ پجاری سرانجام دیگا۔ نینا بڑی خوش قسمت تھی کہ ایک ایسے بڑے سردار سے بیاہی جانے والی تھی جو کسی طرح بھی ایک راجہ سے کم نہ تھا۔ اور سنا ہے، لوہار نے کہا کہ نینا کے باپ نے تاشی پور کے سردار سے تین ہزار روپیہ لیا ہے۔ اب یہ سزا دینے والے بودھ پنچ کہاں سو گئے ہیں۔ گاؤں کا لوہار بہت دیر تک اسی طرح کبالا سے باتیں کرتا رہا۔ اور کبالا سر جھکائے ایک چپل میں سوت کے ٹانکے لگاتا رہا۔ اور جب لوہار وہاں سے رخصت ہوگیا تو نمبردار کا بھیجا ہوا ایک آدمی آگیا اور اس نے کبالا سے کہا۔ کہ نمبردار کہتا ہے کہ کبالا سے کہو کہ وہ نینا کیلئے عروسی چپل کل صبح تک تیار کردے۔ کیونکہ انھیں کل صبح ہی اونتی پور جانا ہے۔ پرسوں نینا کی شادی ہے،

نینا کی شادی؟ کبالا کے دل میں خیال آیا کہ پہلے تو عروسی چپل بنانے سے انکار کردے اس نمبردار کے بھیجے ہوئے آدمی کا گلا گھونٹ ڈالے۔ نمبردار کی جان لے لے۔ اور پھر اسی پہاڑ کی چوٹی سے گر کر نیچے کی چٹان پر اپنا سر پٹخ دے لیکن اس نے بڑی مشکل سے آخر اپنے غصے اور ناامیدی پر قابو پالیا۔ اور نمبردار

کے آدمی سے اشاروں میں کہا کہ وہ نمبر دار کے حکم کی ضرور تعمیل کریگا لیکن اِسوقت اس کے پاس نقرئی تار نہیں ہیں وہ انھیں کھنیتر سے لائیگا اور کل صبح تک عروسی چپل ضرور تیار کر دے گا۔ لیکن دوسرے دن جب نمبر دار کا آدمی چپل لینے کیلئے آیا تو کبالا نے ہاتھ جوڑ کر اس سے اشاروں میں کہا کہ عروسی چپل تیار نہیں ہے۔ وہ کھنیتر گیا تھا لیکن اسے نقرئی تار کہیں سے نہ ملے اور وہ بے نیل مرام واپس آ گیا۔ اسے بہت افسوس تھا کہ عروسی چپل کے تیار نہ ہونے سے شادی میں رخنہ پڑتا تھا۔ لیکن وہ کیا کرے وہ بالکل ناچار تھا۔

جب نمبر دار کے آدمی نے یہ باتیں اپنے مالک سے کہیں تو وہ بہت سیخ پا ہوا۔ اس نے بدبخت گونگے کو بے نقط سنائیں، کمینہ بدمعاش، گونگا وہ اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتا ہے کیا؟ خبیث شیطان، کیا وہ سمجھتا ہے کہ اگر عروسی چپل نہ ہوگی تو نینا کی شادی رُک جائیگی وہ اس پاجی کو نینا کی شادی سے واپس آنے پر ضرور مزا چکھائے گا وہ ایسا انتظام کرے گا کہ مہنڈر کے لوگ تو کیا آس پاس کے کسی گاؤں کا کوئی آدمی بھی اس کے ناپاک ہاتھوں کا بنا ہوا جوتا نہ پہنے لیکن ذرا وہ اپنی لڑکی کی شادی سے فارغ ہو لے۔

کچھ دیر بعد اسی اخروٹ کے درخت کے تلے کھڑے ہو کر کبالا نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگ اوانتی پور کو جانیوالے راستے کیطرف اکٹھے

ہو رہے ہیں. گاؤں کے نمبردار کو اس کے مبارک سفر پر روانہ کرنے کے لئے. پھر کچھ عرصے کے بعد ڈھول، قرنوں، نفیریوں اور مقدس منتروں کی آواز کے درمیان نمبردار نینا اور اپنے عزیز و اقارب کو لے کر اوانتی پور کی جانب روانہ ہو گیا. کبالا دیر تک کھڑا دیکھتا رہا. یہاں تک کہ ساز و سامان سے لدی ہوئی خچریں اور قافلے کے لوگ تنگ راستے سے گزرتے ہوئے اگلے موڑ پر غائب ہو گئے.

اس کے سینے سے ایک آہ نکلی، اچھا! تو یہ اس کی محبت کا انجام تھا. لیکن اسے اس سے بہتر انجام کی امید ہی کیوں ہوئی؟ وہ چپ چاپ سر جھکائے اپنے لکڑی کے گھر کے اندر داخل ہو گیا. کھنڈا اس کے قدموں کے ساتھ لگا ہوا تھا. کبالا نے غصے میں آکر اسے ایک دو ٹھوکریں لگائیں لیکن غریب کھنڈا چلایا نہیں. بلکہ اپنے مالک کو اداس نگاہوں سے دیکھتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آ گیا.

کبالا نے گھاٹ پر بیٹھ کر اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور کھنڈا نے اپنی تھوتھنی اس کے دونوں پاؤں کے درمیان رکھ دی. پھر ایک بہت لمبے عرصہ کے بعد کبالا نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر کھنڈا کو اٹھا لیا اور اسے گلے سے لپٹا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا. غریب گونگے کا مضحکہ خیز رونا. لیکن اسے دیکھنے والا وہاں کوئی نہ تھا

ہاں اب اس کا ضمیر اسے بار بار ملامت کر رہا تھا۔ کہ اس نے نینا کیلئے عروسی چپل کیوں نہ تیار کر دیا۔ چمڑا اس کے پاس تھا اور نقرئی تار بھی۔ یہ کیسی کمینہ حرکت تھی۔ آخر اس میں نینا کا کیا قصور تھا؟ اور اب کیا نینا عروسی چپل پہنے بغیر ہی بیاہی جائے گی۔ ننگے پاؤں، کتنی شرم کی بات تھی، لیکن وہ تو اب بھی اس کے لئے ایک ایسا عمدہ عروسی چپل تیار کر سکتا تھا کہ جس پر کنول کے پھولوں کا دھوکا ہو۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ کیوں نہ ابھی عروسی چپل تیار کرنے کیلئے بیٹھ جائے۔ وہ راتوں رات سفر کرتا ہوا اگلی صبح اوانتی پور پہنچ سکتا تھا اور شادی سے پہلے خود اپنے ہاتھوں سے نینا کے پاؤں میں چپل پہنا سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے چپل بنانے کا تہیہ کر لیا۔ اور چمڑا صاف کرنے بیٹھ گیا۔

جب کبالا نے چپل کو مکمل کر لیا تو اس وقت مغرب میں شفق کی سرخی بھی باقی نہ رہی تھی۔ چاروں طرف پہاڑوں پر سیاہ بادل اُمڈ آئے تھے۔ اور اپنے سانس روکے ہوئے پہاڑی کے گرد حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ تب دھیمے سے ایک انگڑائی لے کر رات کی رانی جاگ اُٹھی۔ اور اس نے بادلوں کو اپنے گرد پا کر خوشی اور مستی سے ناچنا شروع کر دیا۔ اس کے پازیب کی جھنکار بدھ مندر کے منگولی برج اور گاؤں کی منقش چھتوں میں لرزتی ہوئی معلوم ہوتی

تھی۔ اور اس کی کلائیوں میں پڑے ہوئے نقرئی کنگن رہ رہ کر کوند جاتے
تھے۔ ان ہی کی چمک میں گاؤں کے لوہار اور کمہار نے دیکھا کہ اوانتی کو
کے پر پیچ اور دشوار گزار راستے پر کیالا سر جھکائے اور بغل میں کچھ
دبائے کھنڈا کو ساتھ لئے جا رہا ہے۔



اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس رات مہنڈر کی وادی
میں ایک ہیبت ناک چیختا ہوا طوفان آیا۔ وہ طوفان جس نے پہاڑ
کے بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا۔
نمبردار کے اونچے گھر کی منقش چھت اڑ گئی۔ اور پرانے
بودھ مندر کا برج پارہ پارہ ہو گیا۔ شمالی ہواؤں کے برفانی خراٹے چاروں
طرف ژالہ باری کرتے گئے۔ اور پھر ایک شدید ہولناک برفباری شروع
ہوئی جس نے صبح ہوتے تک مہنڈر اور کھنیتر اور تاشی پور کے
کہساروں کو برف کی ایک سفید گہری چادر سے ڈھانپ دیا۔ اور
دوسرے دن دوپہر کے وقت جب تاشی پور کا بودھ سردار اپنی دلھن
کو لیکر تاشی پور روانہ ہوا۔ اور برات شہنائیاں بجاتی ہوئی اوانتی

کی درمیانی بلند گھاٹی میں سے گزری تو براتیوں نے دیکھا
کہ گھاٹی میں سفید برف پر دور تک قدموں کے نشان پڑے
ہیں۔ اور ایک بڑے تناور درخت کے نیچے ایک بدقسمت
راہ گیر مرا پڑا ہے۔ اس کا کتّا اس کے پاؤں میں منہ دیئے
ہوئے اکڑ گیا تھا۔

راہگیر کے ہاتھ اس کی چھاتی پر بندھے ہوئے تھے
اور وہ ان کی مضبوط گرفت میں کوئی چیز تھامے ہوئے تھا
——— یہ ایک پتلا کاغذی چمڑے کا بنا
ہوا عروسی چپل تھا۔ اور اس پر چاندی کی تاروں سے
کنول کے دو خوبصورت سفید پھول کڑھے ہوئے تھے



تلاش

وہ مصور تھا۔ اسے حسنِ معصوم کی تلاش تھی۔ اس کی تلاش میں وہ سرسبز وادیوں اور بے آب وگیاہ میدانوں میں گھومتا رہا۔ اس نے بڑے بڑے شہروں، چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دور دور کے اِکّے دُکّے گاؤں میں اس کی تلاش کی۔ لیکن اسے نہ پاسکا۔ ایک دفعہ ایک کھیت کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے ایک گلاب کے حسین پھول کو دیکھا کہ باڑ سے باہر جھکی ہوئی شاخ پر بیٹھا ہوا اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ لیکن بیشتر اس کے کہ مصور اس کی ایک پتی کا ہلکا سا نقش ہی اُتار سکتا۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا۔ اور گلاب کی نازک پتیاں اُٹھلاتی ہوئی ہوا کے دوش پر بکھر گئیں۔

ایک دفعہ جھیل کی نیلی خاموش سطح پر اس نے کنول کے نوزائیدہ پھول کو دیکھا کہ سر جھکائے پانی میں اپنا چہرہ دیکھ رہا ہے خوبصورت، نازک، زرد اور سپید اور برف کیطرح پاک و صاف مصور نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنا رنگوں والا ڈبہ کھولا۔ یکایک جھیل کی خاموش سطح پر چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھیں اور کنول کے پھول کی طرف بڑھتی گئیں۔ انھوں نے اِسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور پھر موت کے دلکش راگ گاتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

کبھی کسی "رواں رواں" کرتے ہوئے کنوئیں کے قریب سے گزرتے ہوئے مصور کو گمان ہوتا کہ اس نے پانی بھرتی ہوئی حسینہ کی آنکھوں میں اسے دیکھ لیا ہے۔ وہ آہستہ سے اپنی متجسّس نگاہیں حسینہ کے چہرے کی طرف پھیر دیتا اور عین اس وقت کہ جب پیتل کی گاگر میں پانی رقص کرتا ہوا باہر اچھل پڑتا۔ حسینہ مصوّر کی طرف دیکھ کر مسکرا پڑتی۔ ایسی مسکراہٹ جو گویا مصور سے کہہ رہی تھی۔ "میں تجھے صدیوں سے جانتی پہچانتی ہوں" اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی بڑے شہر میں چلتے چلتے مصوّر نے سڑک کے کنارے ایک خوبصورت بچے کو کھیلتے ہوئے دیکھا اور ٹھٹھک گیا۔ اور اس نے بچے کو پیار سے بلایا۔

شریر ننھے نے مصوّر کی طرف ایک چھوٹا سا پتھر کھینچ مارا اور پھر اپنی جسارت پر خود ہی ہنسنے لگا۔

مصوّر کا دل پریشان ہوگیا۔ لیکن اس نے اپنی تلاش کو جاری رکھا۔

وہ ایک صحرائی ہرنی کیطرح وحشی تھی اور آسمان پر اُڑتی ہوئی ابابیل کی طرح نغمہ ریز، وہ ہر روز جنگل میں اپنا ریوڑ چرانے جاتی تھی۔ وہاں وہ ایک چٹان پر جو سرسبز کائی سے ڈھکی ہوئی تھی بیٹھ جاتی..... گہرے سیاہ اور ریشم کی تاروں کی طرح نرم ونازک بال اپنے شانوں پر بکھیر دیتی اور بھیڑ بکریوں کے ننھے ننھے بچوں سے کھیلتی رہتی۔ جنگل کے گھنے سایوں میں کہیں کہیں سورج کی کرنیں جھلملاتی رہتی تھیں یا اور کہیں کہیں دھوپ کے بڑے بڑے بالوں میں چیڑھ کے نکیلے جھومر کسی نامعلوم مسرت کے زیرِ اثر تھرتھراتے رہتے تھے۔ کبھی مشرقی ہواؤں کے لطیف جھونکے انہی جھومروں میں بیٹھ کر دلکش گیت سناتے تھے اور پھر یکایک گیت سناتے سناتے تھم جاتے۔ کیونکہ اب وہ چٹان پہ بیٹھی

ہوئی گا رہی تھی۔ وہ مسرت افزا نغمے بھیڑ بکریوں کے ننھے بچوں کیلئے میٹھی میٹھی لوریاں تھیں۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا کہ گیت سنتے سنتے ہوا تھم جاتی۔ پھول غنودگی میں آکر اونگھ اونگھ جاتے اور سارا جنگل کسی نامعلوم سپنے میں کھو جاتا۔

ایک دن دوپہر کے وقت مصور کا گزر اس جنگل سے ہوا۔ وہ چٹان پر بیٹھی تھی۔ اور اپنی گود میں ایک بھیڑ کے بچے کو لئے ہوئے اس سے کھیل رہی تھی۔ وہ کبھی اُسے دور اوپر ہوا میں پھینک دیتی اور پھر باہیں پھیلا کر تھامتے ہوئے بچے کو اپنی آغوش میں لے لیتی۔ اور اسے زور سے اپنی چھاتی سے لگا لیتی اور کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

مصور نے لڑکی کو دیکھا اور ٹھہر گیا اور بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا "ادھر ——— میرے قریب آ کر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے لئے ایک نہایت خوبصورت تصویر بناؤں گا۔"

وحشی لڑکی نے حیران نگاہوں سے مصور کی طرف دیکھا پھر اس نے ایک خفیف سی جنبش کے ساتھ سر کو جھٹک دیا۔ اور مصور کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

دن گزرتے گئے مصوّر بہت خوش تھا۔ تصویر آدھی سے زیادہ مکمل ہو چکی تھی۔ چند دنوں میں وہ اُسے مکمل کرلے گا اور پھر تصویری دنیا میں اس لافانی شاہکار کو پیش کرکے شہرتِ دوام حاصل کرے گا۔

اور گاؤں میں لڑکی ناچ ناچ کر اپنی ہم جولیوں سے کہتی۔

"وہ میرے لئے ایک تصویر بنا رہا ہے۔ ایک نہایت اچھی، خوبصورت تصویر، آہا ہا کتنی اچھی تصویر ہوگی"۔ اور پھر وہ باہیں پھیلا کر اپنے ناچتے ہوئے قدموں پر گھوم گھوم جاتی۔ آہاہا، آہا ہا۔ اس پر گاؤں کی بڑی بوڑھی عورتیں ایک مضمحل انداز میں مسکرا دیتیں اور نوجوان چرواہے کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر چپ ہو رہتے۔

▲

ایک دن جب وہ صبح کے وقت ریوڑ کو گلے سے باہر نکال رہی تھی۔ ایک نوجوان چرواہے نے اس سے پوچھا۔

"کیا تمھیں پتہ ہے بیلی کہ وہ تمہاری تصویر بنا رہا ہے؟ کیا تمھیں پتہ نہیں؟"

"نہیں تو ——— لیکن اگر تم چاہو تو میں اس سے

پوچھ سکتی ہوں۔"

لیکن چرواہے نے پھر سوال کیا۔" اور کیا تمھیں یہ پتہ بھی نہیں کہ وہ تمہاری تصویر کیوں بنا رہا ہے ؟"

"نہیں ——— لیکن اس نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ تصویر بنا کر مجھے دیگا ..... کیوں ..... کیا بات ہے ؟"

نوجوان چرواہا ہنستے ہنستے جھک گیا۔ آہ ..... اوہ ..... اوہ ..... تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ تمھاری ہی تصویر ہے ..... اوہ ..... بیوقوف معصوم لڑکی ..... اوہو ..... اوہو ہو تم کس قدر بھولی بھالی ہو۔ اور تم یہ بھی نہیں جانتیں کہ وہ تمہاری تصویر کیوں بنا رہا ہے ؟ کیوں ؟ اوہو ہو۔' !

لڑکی پریشان ہو گئی اور آج اپنی عمر میں پہلی مرتبہ وہ کسی دوسرے آدمی کو ہنستے دیکھ کر خود نہ ہنسی۔ پھر ریوڑ کو لے کر وہ آہستہ آہستہ جنگل کی طرف چلی گئی۔

مصور نے اس کی طرف دیکھ کر رک رک کر کہا۔

"تم آج دیر سے آئی ہو اور معلوم ہوتا ہے کہ کچھ سوچ رہی ہو۔"

"ہاں مجھے آج دیر ہی ہو گئی۔" لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ مصور کی موجودگی میں ہمیشہ خوشی محسوس کیا کرتی

تھی۔" راستے میں مجھے حسن ملا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا وہ تمہاری ہی تصویر بنا رہا ہے: میں نے جواب دیا۔ مجھے پتہ نہیں کیا یہ میری تصویر ہے؟ کیا میں اس تصویر میں ہوں؟"

"ہاں، لیکن تم ایسا کیوں پوچھتی ہو؟

"اوہ ——— یونہی ——— لیکن میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم میری تصویر کیوں بنا رہے ہو؟"

مصور بے چین ہو گیا۔ اس نے لیلےٰ کی طرف دیکھا۔ اور پھر چپ ہو رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ آج اس کے ہاتھ تصویر پر جمتے ہی نہ تھے۔

شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں گاؤں جاتے ہوئے راستے میں اُسے حسن مل گیا۔

"کیا تم نے اس سے پوچھا تھا؟"

"ہاں ...... اس نے کہا وہ میری ہی تصویر ہے۔"

"لیکن ..... کیوں؟"

"اس نے اور کچھ نہیں کہا۔؟"

"آہ۔ میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں۔" حسن نے لیلیٰ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "اسے تم سے محبت ہے، لیلیٰ اسے تم سے

محبت ہے۔ تم بہت حسین ہو لیلیٰ، کیا تم نہیں جانتی ہو کہ تم کس قدر حسین ہو؟ مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے، میری معصوم لیلے! محبت، کیا تمھیں پتہ ہے کہ محبت کسے کہتے ہیں؟"

جیسے لیلیٰ کی روح کا ذرّہ ذرّہ صدیوں کی نیند سے جاگ اٹھا. کوئی اس کے دل کے دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹا رہا تھا اور چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا۔ اٹھ بھکارن دروازہ کھول دے کہ یہ معبد میرے بغیر سونا پڑا ہے. کوئی اس کی آنکھوں کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا.

یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے. اور پھر اسے ایسا معلوم ہوا گویا معبد کے دروازے کھل گئے اور لاکھوں کروڑوں پجاری سمندر کی لہروں کیطرح ہچکولے لیتے ہوئے اندر داخل ہو گئے. طوفان، بادل کی گرج، بجلی کے چمکتے ہوئے تیز دھارے میں اور لاکھوں گھنٹیوں کا پرشور آواہن، لیلیٰ یک لخت ڈر گئی. ایک عجیب خوف وہراس سے اس کا سارا بدن کانپنے لگا. اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بھاگ گئی.

رات کو بستر پر لیٹے لیٹے اس کی آنکھوں میں آنسو بار بار آئے. لیکن نیند ایک دفعہ بھی نہیں.

دوسرے دن صبح اٹھ کر وہ جھیل کے کنارے گئی اور دیر تک اپنا چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنے بالوں کو دیر تک سنوارا اور دیر تک ہی اپنی نرم نرم اور سونے کی طرح حسین باہوں کو صاف کرتی رہی. جب وہ جھیل کے کنارے سے اٹھی. تو اس نے اپنی باہیں پھیلا دیں اور ایک انگڑائی لے کر ہنسی. ایک عجیب ہنسی، صبح کی پہلی کرنوں میں اس کے دانت موتیوں کی طرح چمک اُٹھے.

جنگل کی طرف جاتے ہوئے راستے میں اس نے بنفشہ کے پھولوں کا ایک گچھا دیکھا. اس نے اُسے توڑ کر اپنے بالوں میں لگا لیا. اب اس کی نگاہوں میں نئی چمک تھی. اور لبوں پر ایک نئی مسکراہٹ

جب مصور نے اسے دیکھا تو حیران رہ گیا. اس نے متوحش اور دردناک لہجہ میں پوچھا۔ "تم اسے کہاں چھوڑ آئیں ؟"

لیکن لڑکی کچھ نہ سمجھی.

مصور اپنی جگہ سے اُٹھ کر لڑکی کے قریب گیا۔ اور اس کے شانے زور سے ہلا کر کہنے لگا. آہ یہ تم نے کیا کر دیا، تم نے اُسے کہاں چھوڑ دیا۔"

لڑکی کچھ نہ سمجھی، لیکن مسکرا دی.

مصور گلوگیر لہجہ میں چلّایا۔" وہ کہاں ہے سچ بتاؤ وہ کہاں

ہے ؟ میری لیلے ...... کم بخت لڑکی ! ......"

پھر یک لخت مصور نے اس کے شانے چھوڑ دیئے۔ اس نے حزیں اور شاید خشمگیں نگاہوں سے لڑکی کی نامکمل تصویر کیطرف دیکھا۔ آہستہ سے اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور اُسے چوکھٹے سے باہر کھینچ لیا۔ پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے آہستہ سے اس نے چوکھٹے کو تہ کیا۔ رنگوں اور برشوں کے ڈبے کو سنبھالا اور لڑکی پر ایک نگاہ تک ڈالے بغیر مغرب کی طرف مڑ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔

چند لمحے گزر گئے۔ لڑکی سہمی ہوئی بیٹھی رہی۔ پھر یکایک رونے لگی۔ اور روتے روتے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگی۔ "مت جاؤ، آہ اجنبی مصور مت جاؤ۔ ......"

لیکن مصور نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ سر جھکائے ہوئے جنگل کی مغربی سمت کو جا رہا تھا لڑکی پریشان نگاہوں سے کبھی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہوئے مصور کیطرف کبھی اپنی نامکمل تصویر کے ٹکڑوں کیطرف دیکھ لیتی تھی لیکن وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ ہوا چڑھ کے نکیلے پتوں میں گزرتی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ کہیں دور جنگل میں کوئی بھیڑ کا بچھڑا ہوا بچہ چلا رہا تھا۔ بنفشے کے پھولوں کا گچھا لیلیٰ کے پاؤں میں گرا پڑا تھا